ذوقِ تماشا



پروفیسر شیخ محمد اقبال

ذوقِ تماشا

ترے وجود کی نس نس سے آنکھ جھانکے گی
اگر ہے ذوقِ تماشا نظر کی بات نہ کر



پروفیسر شیخ محمد اقبال

ایم اے انگلش، ایم اے اردو ایم فل
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ انگریزی،
گورنمنٹ کالج سرگودھا

اشاعتِ اوّل : ــــــــــــ ۱۹۹۳ء

تعداد : ــــــــــــ ۱,۰۰۰

طابع : (انصار آرٹ پریس بلاک ۱ سرگودھا)

قیمت : ــــــــــــ -/۴۰ روپے

خطاطی : ــــــــــــ شاہد محمود

کمپوزنگ : ــــــــــــ سرگودھا کمپیوٹر سنٹر سرگودھا

ناشر : ــــــــــــ شعبہ نشر و اشاعت

پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ ضلع سرگودھا

ملنے کا پتہ :- ۱۳۱۔ رحمت پارک کالج روڈ سرگودھا

سرورق : اسلم کمال

مُصنّف
کی
دیگر کُتب

۱۔ ساحلِ تشنہ لب (شعری مجموعہ)
۲۔ سوالیہ نشان (شعری مجموعہ)
۳۔ جون ڈن شخصیت اور شاعری (تنقید)

زیرِ طباعت کُتب

۱۔ اِک ہمسفر اچھا لگا (شعری مجموعہ)
۲۔ رُومانی انگریزی شعراء کے علامہ اقبال پر اثرات
(تنقیدی مقالہ)

انتساب

اپنے والدِ محترم

شیخ اللہ دِیا

کے نام!

پیش لفظ

عمرِ عزیز کے اڑتالیس میں سے کوئی اٹھتیس برس میدانِ کارزار میں گزرے۔ کبھی فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑے اور کبھی پسپائی اور ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا مگر اشہبِ ہمت اور راہوارِ آرزو اپنی جولانیاں دکھاتے ہی رہے اور کبھی مکمل شکست قبول نہیں کی یہ معرکے بڑے دلچسپ اور خیال افروز ثابت ہوئے۔ کبھی موقع ملا تو ان کی روداد رقم کروں گا لیکن جس دشمنِ جاں کے خلاف دل و جان صف آرا رہے اور گھمسان کا رَن پڑتا رہا۔ اُس کے ذکر ہی سے بہت سوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں اور الاماں اور الحفیظ کے کلمات اُن کے لبوں پر جاری ہو جاتے ہیں لیکن حقیقت سے کوئی مفر نہیں ابتلاء و آزمائش ہی سے غالباً زندگی کا خمیر تیار ہوا ہے۔ تگ و تازِ حیات ہی سے ہمارا وجود عبارت ہے اور ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی کا جذبہ بڑے بڑے معرکے سر کرنے کا جنوں پیدا کر دیتا ہے۔

ابتلاء و آزمائش نت نئی اشکال میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں اور لہو گرم کرنے کا بہانہ ہوتی ہیں۔ ہماری صلاحیتوں کو مہمیز کرتی ہیں بہرکیف

یاد رہے کہ میرا نامہرباں دشمنِ جاں جس نے مجھ پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے اور خون کے آنسو رُلائے اور نت نئی آزمائشوں میں ڈالا، میری نابینائی ہرگز نہیں تھی جیسا کہ اکثر میرے کرم فرما سوچنے لگتے ہیں بلکہ وہ معاشرتی رویے تھے جو قدم قدم پر مزاحم ہوتے رہے اور طرح طرح کے ستم ایجاد کرتے رہے۔ معاشرتی زاویوں کا آسیب ہمیشہ میرے دل و دماغ پر منڈلاتا رہا اور یہ آسیب کسی پیر و فقیر کے قبضے کا بھی نہ تھا اگر ایسا ہوتا تو میرے مہربانوں میں پیروں، فقیروں کا کوئی فقدان نہیں تھا تاہم اس کا سدباب شاید میرے اپنے بس میں تھا ؎

تیرے دکھوں کا مداوا ہے خود ترے بس میں
کسی طبیب کسی چارہ گر کی بات نہ کر

میرے والدین، اساتذہ کرام، رفقاء اور طلباء اپنی بساط کے مطابق میری دلجوئی اور حوصلہ افزائی کرتے رہے لیکن وہ بھی اس سماج کا حصہ تھے جس کی سوچ اچانک تبدیل نہیں ہوسکتی تھی تاہم یہ حضرات نیک نیت تھے اور اُن کی یہ نیک نیتی دشتِ حیات کی چلچلاتی دھوپ میں اکثر و بیشتر شجرِ سایہ دار کی صورت اختیار کرتی رہی اور یوں میرا سفر مختلف مراحل سے گزرتا رہا۔

لیکن میں اکثر سوچتا رہا کہ تمھیں تو کچھ سایہ دار درخت، کچھ آنچل، کچھ گھٹائیں، خنک ہوائیں ملتی رہیں مگر صحرائے زندگی میں ہر ایک کی قسمت تو ایسی نہیں ہوتی اور پھر جھلستی ہوئی دھوپ میں مجھے کتنے برہنہ پا، اور برہنہ سر ملے اور مجھے احساس ہوا کہ اُن کی جہدِ حیات میں بھی اُن کا ہاتھ بٹانا، انہیں سائبان فراہم کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔ چنانچہ میں شروع ہی سے نابیناؤں کے لیئے ملک گیر تحریک میں شامل رہا اور دامے درہمے، سخنے، قدمے اُن کی مدد کی اور اپنے احباب اور طلبار کو تیار کیا کئی بے بصر افراد کو زیورِ علم و ہنر سے آراستہ و پیراستہ کیا اور اب بھی مشن جاری ہے۔

مگر اس سے بڑا محاذ معاشرتی رویّوں کو تبدیل کرنے کا محاذ تھا اور ہے۔ اس پر میں نے ہر جنگ لڑی لیکن قلم کی جنگ سب سے مؤثر متصوّر ہوتی رہی ہے۔ حروف میں وہ قوّت ہے کہ وہ دل و دماغ میں پیوست ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ان کا نمو خونِ جگر سے ہوا ہو۔ چنانچہ ماہنامہ "سفید چھڑی" میں قرطاسِ ابیض کے نام سے مختلف نہایت سنجیدہ پہلوؤں پر اپنی بساط کے مطابق اظہارِ خیال کیا اور واضح کیا کہ معاشرہ کس طرح اپنی سوچ کو مثبت فکر میں تبدیل کر سکتا ہے کس طرح بے بصر حضرات کی سچ مچ مدد و اعانت کر سکتا ہے؟ کون کون سے

مسائل ہیں جو نابینا حضرات کو درپیش ہیں اور اُن مسائل کے حل کے سلسلے میں حکومت اور عوام کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ میری تجاویز انتہائی توجہ کی مستحق ہیں یہ درست ہے کہ ہمارے ملک میں نابینائی سے متعلق اعداد و شمار دستیاب نہیں جس کی وجہ سے واضح خطوط پر کام کرنا خاصا دشوار ہے تاہم میں نے اپنے تجربات، اپنے علم اور معلُومات کی روشنی میں چند ایک معروضات پیش کرنے کی جسارت کی ہے جیسا کہ عرض کیا گیا کہ کوئی دس ایک سال کی عُمر سے مجھے نابینا حضرات میں رہنے کا اتفاق رہا ہے۔ کیونکہ اسی عُمر میں میں بینائی سے محروم ہو گیا اور پھر مجھے جانے کن کن مراحل سے گزرنا پڑا۔

میں پہلا نابینا طالب علم تھا جو باقاعدہ کسی کالج میں داخل ہوا، ایم اے کیا اور لیکچرر بنا۔ چنانچہ میری مشکلات کا اور جدّوجہد کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں۔ اِنہی تجربات کی روشنی میں مجھے یہ اعزاز حاصل ہو سکا ہے کہ میں نابیناؤں سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر سکا ہُوں اور ٹھوس تجاویز پیش کرنے کی جسارت کر سکا ہُوں مجھے یقین ہے کہ میری یہ کاوش بارش کا پہلا قطرہ ہے اِس ضمن میں نہایت سنجیدہ کاوشوں کی ضرورت ہے۔

اِن مضامین کو کتابی صُورت دینے کا خیال اِس لیئے ذہن

میں آیا کہ اِس طرح بہت سے احباب بے بصر حضرات کے مسائل سے آگاہ ہو سکیں گے اور اِس طرح یہ پیغام بڑی سرعت کے ساتھ دُور دُور تک پہنچ سکے گا۔ میں اپنی اِس کاوش کی تیاری میں اپنے بہت سے احباب کا شکر گزار ہوں جن میں سیّد نسیم الغنی، محمّد اشرف شاہین، شاہد اسلام دانش، رانا محمّد اقبال اور محمّد اسحٰق کُنڈ شامل ہیں۔

پروفیسر شیخ محمّد اقبال

مورخہ: ۲۷ فروری ۱۹۹۴ء

فہرست

حرفِ آغاز

لفظ، جس کے ذریعے تخلیق کائنات کا معجزہ وقوع پذیر ہوا، لفظ جسکی حرارت سے کاروان حیات قدم بہ قدم، منزل بہ منزل لمحہ بہ لمحہ، مستقبل کی سرحدوں میں داخل ہو رہا ہے اور نئے زمین و آسمان تراشنے میں ہمہ تن محو ہے، لفظ جس نے گوش حیات میں میٹھے میٹھے نغموں کا رس گھولا، لفظ جس کے دم قدم سے رگ زندگی میں آرزوؤں اور تمناؤں کا خون دوڑ رہا ہے لفظ جس نے سل کو دل اور دل کو دھڑکن عطا کی، لفظ جسکے طلسم ہو شربا سے عشق کی ساری ہاؤ ہو اور حسن کی جلوہ سامانیاں قائم و دائم ہیں لفظ جو خدا اور انسان کے درمیان رابطہ ہے لفظ جو کبھی رہنمائی کا فرض سرانجام دیتا ہے۔ آیئے کیوں نہ اس متاع بے بہا کو اس دولت بے پناہ کو اپنے بے بصر بھائیوں کے دکھوں، جذبوں، آرزوؤں اور تمناؤں کی تفہیم کے لیے استعمال کیا جائے اسی جذبہ کے پیش نظر "سفید چھڑی" کا اجراء عمل میں لایا گیا ہے یوں تو زندگی نام ہی مر مر کے جیئے جانے کا ہے اور دکھ درد زندگی کا جزو لاینفک ہے لیکن جب درد حد سے بڑھ جائے تو انسان چیخنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس میں کلام نہیں ابتلاؤ آزمائش زندگی کا سنگھار ہیں اور نگار حیات کے حسن کو دو چند کر دیتے ہیں۔ بقول شاعر مشرق علامہ محمد اقبال۔

خطر تاب و تواں را امتحان است
عیار ممکنات جسم و جان است

اور بقول شیکسپیئر

"SWEET ARE THE USES OF ADVERSITY" لیکن جیسا کہ انسان' انسان ہے اور اکثر و بیشتر غالب کے الفاظ میں کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

لیکن اس رونے والے کی کیفیت دیدنی ہوتی ہے جس کی اشک شوئی کے لئے بھی کوئی موجود نہ ہو' جو خود ہی رونے اور خود ہی اپنے آنسو پونچھنے پر مجبور ہو' جسکی چیخ و پکار زندگی کی بے حس ہواؤں میں کھو جائے۔ کم و بیش یہی حال پاکستان کے چھ لاکھ سے زیادہ بے بصر افراد کا ہے۔ قارئین کرام! یہ پیرایہ اظہار' قنوطیت اور یاسیت پر مبنی نہیں بلکہ ان گنت زہرہ گداز اور روح فرسا حقائق پر مبنی ہے۔

درد کو درد آشنا جانے
جس پہ گذری نہ ہو وہ کیا جانے

ایک لمحہ کیلئے جب برقی اجالے منقطع ہو جاتے ہیں تو یوں محسوس

ہوتا ہے کہ زندگی اندھیروں میں ڈوب گئی ہو ان کے بارے میں سوچئے اندھیرے جن کا مقدر بن گئے ہیں اور ان اندھیروں میں اگر وہ ہمت کے چراغ جلا کر چلنا بھی چاہتے ہیں تو بے حسی اور بے پرواہی کی تندو تیز آندھیاں ان کے چراغوں کو بجھا دینا چاہتی ہیں۔ اگر کبھی کسی دل میں ہمدردی کی کوئی قندیل روشن ہوتی بھی ہے تو دو گام چل کر ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور پھر اندھیرے مزید تکلیف دہ ہو جاتے ہیں۔

ہوائے تند میں ہم بے چراغ ہی اچھے
بجھے چراغ تو کچھ اور تیرگی ہو گی

قارئین محترم! بہ ایں ہمہ پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ ملک کے گوشے گوشے میں اپنے انتہائی محدود ذرائع کے باوجود بے بصر افراد کیلئے سہولتیں مہیا کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے نابینا جہد حیات میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر رہے ہیں اور صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ معاشرے کی فلاح و بہبود اور ارتقاء میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں' وہ حوصلوں کی قندیل جلائے شاہراہ حیات پر افتاں و خیزاں رواں دواں ہیں۔ وہ محرومیوں میں رجائیت کے مہ و انجم تراش لیتے ہیں لیکن بسا اوقات بلکہ اکثر اوقات معاشرتی لاعلمی اور بے حسی ان کی کوششوں کا مذاق اڑانے لگتی ہے۔

جینے نہیں دیتے مجھے مرنے نہیں دیتے
یہ لوگ کوئی کام بھی کرنے نہیں دیتے

کوئی نابینا کتنا ہی پڑھ لکھ لے ہنر یافتہ ہو جائے لیکن ملازمتوں کے دروازے اس کیلئے تقریباً" بند ہیں وہ کتنی بھی صلاحیتوں کا مالک ہو جائے پھر بھی "نابینا ہے" "بے چارہ ہے" "حافظ جی ہے" "قابل رحم ہے" روشن خیالی کا دعویٰ کرنے کے باوجود کوئی اس کا رفیق حیات بننے کو تیار نہیں' کوئی کیا سوچے گا کہ رشتہ ازدواج کیلئے نابینا ہی رہ گیا تھا۔ وہ حافظ قرآن اور عالم دین بھی ہو تب بھی امامت کے لائق نہیں نابیناؤں کی صلاحیتوں کا ڈھنڈورا تو پیٹا جاتا ہے لیکن دل سے کبھی تسلیم نہیں کیا جاتا۔

قارئین کرام! محدودے چند نابیناؤں کی زندگی پر مت جایئے کہ مستثنیات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں کم و بیش ۸۰ فیصد نابیناؤں کو ان کے کرم فرماؤں نے کمال سخاوت اور دریا دلی سے کشکول گدائی تھما دیا ہے اور اپنی جنت کے حصول کی خاطر چند سکے ان کے کشکول میں ڈال دیتے ہیں ۔ ۹۸ فیصد تعلیم یافتہ اور ہنر مند نابینا بے روزگار ہیں اور اگر انہیں روزگار فراہم بھی کیا گیا ہے تو محض یہ سمجھ کر کہ یہ کار ثواب ہے اگر وہ دفتر اور سکول میں آ ہی جائیں تو کافی ہے اس طرح ان کی صلاحیتوں کو مسدود کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ جو نابینا اچھے بھلے زندگی میں کاروبار کر رہے ہیں ان میں سے کم و بیش [illegible] مجبور زندگی گزار

کہ وہ اپنی تخلیقات اور نگارشات کے ذریعے ان مسائل پر اپنے خیالات کا بھرپور اظہار کریں گے اور اس قلمی جہاد میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ کوشش کی جائے گی کہ نابیناؤں کے مسائل کے ساتھ ساتھ "سفید چھڑی" کو ادبی تخلیقات کے لئے بھی استعمال کیا جاسکے تاکہ یہ جریدہ نابیناؤں کا ہو کر نہ رہ جائے اور عوام الناس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر سکے۔ ہماری خواہش ہے کہ ادباء اور شعراء اپنی تخلیقات ہمیں بھیجتے رہیں گے تاکہ اس انجمن کے فورم سے ہم نابیناؤں ہی کیلئے نہیں بلکہ بینا حضرات کے لئے بھی علمی اور ادبی میدان میں اپنا حقیر حصہ ادا کر سکیں اور یوں زندگی اور ادب کے تقاضوں کو ہم آہنگ کیا جاسکے۔

نابینا افراد اور تعلیمی مسائل

بیسویں صدی کو الوداع اور اکیسویں صدی کو خوش آمدید کہتے ہوئے بھی اگر ہمیں تعلیم کی افادیت اور اہمیت کے حق میں دلائل دینے پڑیں تو اس امر میں چنداں شک نہیں رہے گا کہ تہذیبی اور تمدنی طور پر ابھی ہم صدیوں پیچھے ہیں۔ تعلیم نسواں کی تو بات ہی چھوڑیئے آج بھی اس پیارے وطن میں ایسے اصحاب الرائے کی کمی نہیں جو تعلیم نسواں کو کار فضول گردانتے ہیں اور کسی طور پر اس کی اہمیت کے قائل نہیں ہو پاتے اور کم و بیش سو سال پہلے کے اکبر الٰہ آبادی کے الفاظ میں کہنے لگتے ہیں۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ

اور وہ حضرات جو تعلیم نسواں کے حق میں ہیں بھی محسوس کرتے ہیں کہ طالبات کے لئے علیحدہ نصابات تیار کئے جائیں اور علیحدہ درس گاہیں' یہ تو حال ہے ان حضرات محترم کا جو زیور علم سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ تو اس ۸۰ اور ۸۵ فیصد خاموش اکثریت کا کیا حال ہو گا مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ جب انہوں نے اپنی ایک بچی کو سکول میں داخل کروا دیا تو ان کے اعزہ

و اقرباء نے احتجاجا" ان سے تعلقات منقطع کر لئے۔ جانے اس طرح کے کتنے واقعات دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں۔

حضرات معظم! یہ تو حال ہے ۵۰ فیصد ملکی آبادی کا جسے کوئی معذوری لاحق نہیں ایسے میں اگر کوئی بے بصر افراد کی تعلیم کی بات کرے تو شاید کوئی سننے کیلئے تیار نہ ہو۔ اب بھی ابلاغ عامہ کی تمام کوششوں کے باوجود ۹۰ فیصد خواتین و حضرات کو یہ سن کر حیرت ہوتی ہے کہ کوئی نابینا کسب علم کر کے عزت و وقار کی زندگی گزار سکتا ہے۔ ان کے خیال میں تو صرف حفظ قرآن ہی کسی بے بصر کے لئے ممکن ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے پیدا ہوتے ہی "حافظ جی" کے لقب سے نواز دیا جاتا ہے اور مسجدوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ مسجد خدا کا گھر ہے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز و منبع لیکن وہی والدین جو نابینا بچوں کیلئے مسجد اور مدرسے کا انتخاب کرتے ہیں اپنے بینا بچوں کو مالی استعداد نہ ہوتے ہوئے بھی نام نہاد انگریزی سکولوں میں داخل کرا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ اپنی اولاد کے بارے میں یہ دوہری پالیسی معاشرتی رویوں کے پیش نظر سمجھنا چنداں دشوار نہیں۔ مجھے اس موقع پر چند دلخراش واقعات یاد آ رہے ہیں۔ جب آج سے کوئی ۳۵ سال پہلے مجھے شیرانوالہ گیٹ لاہور کے سکول برائے نابینا میں داخل کرایا گیا تو کسی کو یہ یقین بھی نہ تھا کہ میں پڑھ لکھ کر زندگی میں اپنے فرائض انجام دے سکوں گا یہ ان دنوں کی بات ہے کہ اس طرح کے سکول میں اس وقت کے وزیر تعلیم تشریف لے گئے اور نابیناؤں کو پڑھتے لکھتے دیکھ کر پوچھنے لگے کہ "یہ لوگ آخر پڑھ کر کریں گے کیا؟" تو ایک منچلے استاد نے

جواب دیا "جناب والا کم از کم خواندہ بھکاری ضرور بن جائیں گے"۔

مجھے یاد ہے کہ اس سکول سے فارغ ہو کر میں جب نابیناؤں کی بحالی کے لئے محو عمل ہوا تو ایک مسجد میں نابینا حضرات کی تعلیم پر گفتگو کی۔ میری گفتگو سن کر امام صاحب بے ساختہ فرمانے لگے۔

من نمی دانم کہ ایں بیداری است یا کہ خواب

مجھے یاد ہے کہ جب میں بی اے کے لئے گورنمنٹ کالج سرگودہا میں داخلہ حاصل کررہا تھا تو میں نے انگریزی ادب بھی اختیاری مضمون کے طور پر منتخب کیا۔ کالج کے پرنسپل میرے والد سے کہنے لگے "آپ بچے کو جسے نظر بھی نہیں آتا انگریزی ادب جیسا مضمون منتخب کروا کر ظلم کر رہے ہیں"۔

جب میں نے انگریزی ایم اے کرنا چاہا تو میرے اپنے اساتذہ کا بھی

خرچ نہ ہی خوراک اور پوشاک کی کوئی کفالت' تو پھر ایسا کیوں ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ معاشرے نے ابھی یہ قبول ہی نہیں کیا کہ نابینائی محض ایک رکاوٹ ہے' مشکل ہے کوئی عارضہ نہیں۔ نابینا حضرات علم کے ثمرات سے اسی طرح فیض یاب ہو سکتے ہیں جس طرح معاشرے کے دوسرے افراد۔ نفسیاتی طور پر ایک بینا آدمی ایک نابینا کو کم تر سمجھتا ہے کیونکہ وہ دیکھ سکتا ہے اور یہ دیکھ نہیں سکتا مگر کتنے دیکھنے والے زندگی کو دیکھ سکتے ہیں! کتنے دیکھنے والے آج بھی کشکول گدائی لئے ہوئے جابجا نظر آتے ہیں! کتنے دیکھنے والے زیور علم سے آراستہ نہیں! کتنے دیکھنے والے زندگی کا ناسور بن گئے ہیں اور زندگی کا گلا گھونٹنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ثابت ہوا کہ دیکھنا کافی نہیں شعور ادراک کی دولت کے بغیر بینائی محض ایک اتفاق ہے بینائی تو جانوروں اور پرندوں کو بھی حاصل ہے۔ اصل مسئلہ احساس اور شعور کا ہے اس لئے اصل کسوٹی بینائی نہیں شعور اور بالغ نظری ہے۔

نابینا بچّے اور مُعاشرتی رویّے

وہ معاشرہ جو اپنی کوتاہ بینیوں' کوتاہیوں' کم کوشیوں اور غلطیوں کو قسمت سے منسوب کر کے خوش ہو رہتا ہے اور اطمینان سے زندگی گزارتا نظر آتا ہے اگر کسی امتحان یا ابتلاء و آزمائش میں منہ کی کھاتا ہے تو قسمت کو مورد الزام ٹھہراتا ہے۔ شیکسپیئر کا ایک کردار ایڈمنڈ جو کچھ ایسے افراد کے بارے میں کہتا ہے انتہائی دلچسپ ہے۔

" This is the excellent foppery of the world, that when we are sick in fortune, often the surfeit of our own behaviour make guilty of our disasters, the sun, the moon, the stars: as if we were villains by necessity; fools by heavenly compulsion, knaves, thieves, treacherous, by spherical predominance, drunkards, liars adulterers, by an enforced obedience of planetary influence."

یعنی "خود پاپ کرو نام ہو شیطان کا بدنام" لیکن اس کے برعکس جہاں سچ مچ مشیت ایزدی کا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہی معاشرہ کوئی اور منطق استعمال کرتا ہے۔ مثلاً کوئی بچہ رضا کارانہ طور پر معذور نہیں ہوتا اس کی پیدائش پر اس کا اپنا کوئی بس نہیں ہوتا اس کے والدین اس ضمن میں کسی

طرح مورد الزام نہیں ہو سکتے تو پھر اس بچے کا کیا قصور کہ اس سے بچہ ہونے بلکہ انسان ہونے کے حقوق چھین لئے جائیں۔ ایسا کیوں ہے کہ خود والدین اپنے معذور بچے کو دوسروں سے چھپانا چاہتے ہیں جیسے یا تو وہ خود گناہگار ہیں یا ان کا بچہ کسی جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کبھی معذوروں سے متعلق اعداد و شمار اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی نتائج حوصلہ شکن رہے۔ میں نے اکثر گھروں میں یہ صورتحال دیکھی اور سخت افسوس ہوا ہے۔ مجھے اپنے عزیزوں میں سے ایک خاندان کے بارے میں معلوم ہے کہ ان کا ایک بچہ نابینا تھا اور اس کے پانچ بھائی بینا تھے لیکن کبھی کوئی بھائی اسے ملنے ملانے کہیں نہیں لے گیا۔ اسے کبھی کسی خاندان کی تقریب میں نہیں دیکھا۔ اس طرح کی مثالیں کم و بیش ہر جگہ مل جائیں گی۔ ایسی صورتحال میں معذور بچہ زندگی سے تعلق توڑ لیتا ہے۔ اس میں معاشرتی رجحانات سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے۔ وہ مختلف ذہنی عوارض کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر اسی معاشرہ نے اس کے بارے میں طرح طرح کے مفروضے گھڑ لئے ہوتے ہیں۔ مثلاً" ایک نابینا جسے عرف عام میں اندھا کہا جاتا ہے کے بارے میں چند ضرب الامثال قابل غور ہیں اور معاشرتی رویوں کی بھرپور غمازی کرتی ہیں مثلاً" "اندھا بانٹے ریوڑیاں پھر پھر اپنوں کو ہی دے" اندھا راجہ چوپٹ نگری" "اندھا گائے بہرا بجائے" "اندھا کیا جانے بسنت کی بہار" "اندھا ملاں ٹوٹی مسجد" "اندھے کے آگے روئے اپنے نین بھی کھوئیے"۔

اس طرح کی ضرب الامثال سے ہمارا ادب بھرا پڑا ہے لیکن ایسا سوچنے کا اتفاق بہت کم اشخاص کو ہوتا ہے کہ یہ خصوصیات کسی نابینا میں کیوں در آتی ہیں۔ صرف بینائی ضائع ہو جانے سے رویے تبدیل نہیں ہو سکتے کیونکہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے اور اس سے براہ راست اثرات قبول کرتا ہے۔ جہاں تک مستثنیات کا تعلق ہے اسے اصول نہیں بنایا جاسکتا مثلاً" مجھے یاد ہے کہ میرے والدین اور تمام رشتہ دار مجھے چھپانے کی بجائے ہمیشہ دوسروں سے متعارف کراتے رہے ہیں۔ اس وقت بھی جب میں ابھی سکول کا طالب علم تھا اس کے برعکس مجھے ایک دو نیک دل خاندانوں کا علم ہے کہ ایک صاحب اپنے بچے کو ہر طرح کی سہولت بہم پہنچانا چاہتے تھے تاکہ نابینائی اس کے لئے کوئی مسئلہ نہ بنے انہوں نے اس کے لئے ایک الگ انیکسی بنوائی اور دو نوکر دیئے۔ وہ جہاں کہیں جاتا ایک دائیں طرف سے پکڑتا اور دوسرا بائیں طرف سے لیکن اس میں خود اعتمادی پیدا نہ ہو سکی کیونکہ نارمل رویہ اختیار کرنے سے ہی ایک انسان نارمل زندگی گزارتا ہے۔ اگر اسے یہ تاثر دیا جائے کہ وہ دوسروں سے مختلف ہے تو یقیناً نتائج منفی ہوں گے۔ ان معروضات کا منشاء یہ ہے کہ معذور بچوں کے بارے میں رویے تبدیل کئے جائیں۔ معذور بچے کو وہ تمام سہولتیں حاصل ہونی چاہیئں جو اس کے بہن بھائیوں کو حاصل ہیں۔ اسے کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا جائے کہ وہ ان سے کسی طرح مختلف ہے۔ چلتے پھرتے وقت اپنے ساتھ رکھا جائے راستے کی ٹھوکروں سے بچا کر ہم اسے زندگی کی ٹھوکروں سے نہیں بچا سکتے۔



نابینا افراد اور گداگری

نابینا افراد کے لئے اداروں، تنظیموں اور خود نابینا افراد کے لئے ایک بار ایک سوال نامہ جاری کیا گیا۔ سوالات میں یہ سوال بھی تھا کہ نابیناؤں کے اداروں اور تنظیموں کی سب سے بڑی مشکل کی نشان دہی کیجئے۔ جس کے باعث ان اداروں اور تنظیموں کی تمام تر شبانہ روز کاوشوں کے باوجود نابیناؤں سے متعلق عوام الناس کے رویوں میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں آئی۔ آج بھی پچاس برس پہلے کی طرح نابینا افراد بے چارگی، بے بسی، کم نصیبی کی تصویر تصور کیئے جاتے ہیں۔ کسی بے بصر کو دیکھ کر آج بھی لمبی لمبی آہیں نکلتی ہیں۔ آج بھی ایک نابینا بے چارہ، درماندہ اور خستہ حال ہے۔ اور ہر طرح کے رحم اور ترس کا مستحق تصور کیا جاتا ہے۔ اسے کوئی محنت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اسے کوئی فرائض سونپ بھی دیئے جائیں تو وہ انہیں سرانجام دے یا نہ دے تو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ ٹھہرا جو "بے چارہ نابینا"۔

اگر ایک فی صد کوٹے کی بنیاد پر اسے کسی ادارے میں تعینات کر بھی دیا جائے تو اس ادارے کیلئے اس کا وجود مسعود اور دعائیں ہی کافی ہیں۔

سوال نامہ میں درج اس سوال کے کئی جوابات موصول ہوئے۔
بعض کا خیال تھا کہ اس ہلاکت خیز رویے کی ذمہ داری ہمارے ذرائع ابلاغ پر ہے جنہیں زندگی کے ہر شعبے کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ مگر نابیناؤں اور معذوروں کی صحیح تصویر کشی کا خیال نہیں آتا۔ بعض نے تحریر کیا اس افسوس ناک رویے کی تمام تر ذمہ داری حکومت کی ہے کہ اس نے نابیناؤں کو دوسرے درجے کا شہری تصور کر رکھا ہے اور ایسے مثبت اقدام نہیں اٹھائے جس سے انکی شخصیات کے اصل جوہر ابھر کر سامنے آئیں
بعض کی رائے تھی کہ اس رویے کی اصل ذمہ داری مذہبی اداروں پر ہے جو نابیناؤں کو صرف حافظ دیکھنا چاہتے ہیں اور انہیں جدید تعلیم کے ثمرات سے محروم رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ بینا بچوں کے لئے ان کی رائے مختلف ہوئی ہے اور نابیناؤں کے لئے مختلف۔

بہت سے جوابات وصول ہوئے مگر ایک انتہائی اہم پہلو کو نظرانداز کر دیا گیا۔ اس رائے کو جس نے میری حقیر رائے میں ہر ایک ذی حس انسان کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں جس کے بارے میں سوچ کر ہی وحشت سی ہونے لگتی ہے اور یہ ہے نابیناؤں میں گداگری کا رجحان۔ یوں تو پورے معاشرے کے لئے یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے اور مہذب اقوام کے ماتھے پر ایک کلنک کے ٹیکے سے کم نہیں۔ گداگری انسان کو کتنا کوتاہ قد اور پست قامت بنا دیتی ہے اگر کوئی آنکھ اسے دیکھ لے تو لرز کر رہ جائے۔

کشکول گدائی اس امر کا غماز ہے کہ کشکول زندگی میں کچھ بھی باقی

کے سامنے ہاتھ پھیلانا گویا زندگی کا منہ چڑانا ہے ایسا انسان زندہ تو ہے مگر زندگی سے عاری۔ لیکن جب کوئی نابینا ہاتھ پھیلاتا ہے تو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے والے تمام نابینا اپنی کوششوں کو ملیا میٹ ہوتے ہوئے اپنی ہی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ نابیناؤں کیلئے اداروں اور تنظیموں کا یہ نعرہ بلند کرتے کرتے آواز بیٹھ گئی ہے کہ نابینائی ایک مشکل ضرور ہے لیکن اس سے انسان کی صلاحیتیں ہرگز سلب نہیں ہوتیں۔ لیکن جب کوئی نابینا بھکاری اپنی نابینائی کے واسطے سے دست سوال دراز کرتا ہے تو ایک لمحے کے لئے تمام حوصلوں کا ہاتھ پھیل جاتا ہے گویا پورے نابینا افراد بھیک مانگنے لگتے ہیں۔ یہ اندوہ ناک منظر ہر بس' ہر گاڑی اور ہر شاہراہ پر نابیناؤں کے لئے تنظیموں اور اداروں کا منہ چڑا رہا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ نابیناؤں کے ہاتھوں میں کشکول گدائی کس نے تھمایا۔ ان کی مجبوری نے یا سخی لوگوں کی دریا دلی نے؟ ان کی بے بسی نے یا اہل ثروت کی غلط سخاوت نے؟ ان کی بے چارگی نے یا معاشرتی احساس ترحم نے؟ لوگ ایک دو روپیہ دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے لئے جنت کے دروازے وا ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اپنا انسانی فرض ادا کر دیا لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے خود داری اور عزت نفس پر ضرب کاری لگائی ہے اور ایک گھناؤنا جرم کیا ہے ایک انگریزی قول ہے کہ "انہیں پینی مت دیجئے پاؤنڈ کمانے کے قابل بنائیے"۔

بینا حضرات بھیک مانگتے نظر آئیں تو یہ الگ بات ہے کیونکہ اس سے بینا افراد کا وقار مجروح نہیں ہوتا کیونکہ بیناؤں میں مجبور بھی ہیں جابر بھی'

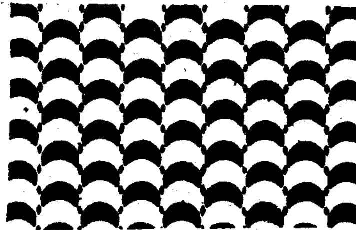
دینے والے ہاتھ بھی ہیں اور لینے والے ہاتھ بھی' لیکن نابینا تو ہیں ہی " بے چارے مجبور اور لاچار" اگر وہ دوسرے درجے کے شہری بننے کی بجائے پہلے درجے کے شہری بننا چاہتے ہیں' لوگوں کی نگاہوں میں باعزت اور باوقار ہونا چاہتے ہیں تو نابیناؤں کے کشکول گدائی اور اس کشکول میں کھنکتے سکے ڈالنے والے ان کی اس کوشش کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔

نابیناؤں کی شادی کے مسائل

مختلف مواقع پر دوران سفر اکثر و بیشتر بہت سے سوالات کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے۔ بہت سے سوالات نہایت دلچسپ ہوتے ہیں اور پوچھنے والوں کی معصومیت کی غمازی کرتے ہیں۔ مجھے کبھی کبھی حیرت انگیز مسرت ہوتی ہے اور کبھی کبھی تاسف کی شدید لہر دل و دماغ میں دوڑنے لگتی ہے کہ سوال کرنے والے مجھے سرے سے انسان بھی سمجھتے ہیں یا نہیں؟ لیکن ہمیشہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ صدیوں سے عوام الناس کے اذہان میں جو مفروضے قائم ہو گئے ہیں ان کی تصحیح ممکن ہو سکے۔ بہر حال یہ سوالات کسی اور موقع کیلئے اٹھائے رکھتا ہوں اور ایک اہم سوال کی طرف آپکی توجہ مبذول کرواتا ہوں جو پاکستان کے چھ لاکھ نابیناؤں کیلئے سوہان روح بنا ہوا ہے۔ بہرحال یہ سوال مجھ سے فی الفور نہیں کیا جاتا بلکہ آغاز کچھ یوں ہوتا ہے "حافظ صاحب" آپ کیا کرتے ہیں؟ جب میں انہیں بتاتا ہوں کہ میں ایک کالج میں پڑھاتا ہوں تو وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ آپ کسی نابیناؤں کے کالج میں متعین ہوں گے۔ تو مجھے انہیں بتانا پڑتا ہے کہ ایسا تو کوئی کالج پاکستان میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ تو ان کا تجسس بڑھنے لگتا ہے "اچھا تو آپ

کالج میں اسلامیات کے پروفیسر ہوں گے" لیکن جب میں انہیں بتاتا ہوں کہ میں گورنمنٹ کالج سرگودہا میں انگریزی زبان و ادب کا استاد ہوں تو وہ سراپا حیرت نظر آتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں اسلامیات کا پروفیسر ہونا تو اس لئے ممکن ہے کہ نابینا یہ کام سن سنا کر سرانجام دے سکتا ہے لیکن انگریزی زبان و ادب کا پروفیسر ہونا ان کے لئے کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ چنانچہ کچھ مان لیتے ہیں اور کچھ نہیں مانتے اور وہ سوال جو یہ حضرات کبھی کبھار پوچھ لیتے ہیں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔ "کیا آپ نے شادی کرائی ہے؟" میرے یہ بتانے پر کہ یہ قصہ تو بہت پرانا ہے ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ کسی کی شادی خانہ آبادی پر خوش ہونا بہت اچھی بات ہے لیکن نابیناؤں کے حوالے سے اس خوشی کا مطلب مختلف ہوتا ہے عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ نابینا لاکھ پڑھا لکھا سہی

آپ ایک بینا' بے روزگار کو تو شادی کے قابل سمجھتے ہیں لیکن علم و ہنر سے آراستہ و پیراستہ حضرات کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ اس سلسلے میں سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ پڑھی لکھی تعلیم یافتہ لڑکیاں انتہائی روشن خیال ہیں لیکن انکے والدین یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ اپنے صدیوں کے مفروضوں کو ترک کر دیں۔ یہاں نابیناؤں کے لئے ان کے تحسین و آفرین کے سارے دعوؤں کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں جہاں نابینا افراد نے اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کیا ہے وہاں انتہائی ذہنی ہم آہنگی پائی گئی ہے اور انہوں نے ثابت کیا ہے کہ وہ ایک کامیاب شوہر اور کامیاب بیوی کی طرح ایک گھر بنا سکتے ہیں۔ اپنے بچوں کی نشوونما کر سکتے ہیں اور زندگی کی دوڑ میں کسی طرح بھی پیچھے نہیں رہتے۔ تو پھر ایسا کیوں ہے کہ ابھی تو وہ تعصبات جو معاشرے کا حصہ بن چکے ہیں ختم نہیں ہوئے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی طرف توجہ دلانا انتہائی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر نابینا افراد زندگی کی ان خوشیوں سے فیض یاب ہی نہیں ہو سکتے جو جیتی جاگتی زندگی کا جزو لاینفک ہیں۔



نابینائی اور جمالیاتی حس

یہ ۱۹۸۲ء کی بات ہے کہ میرے پہلے شعری مجموعے "ساحل تشنہ لب" کی تعارفی تقریب میں ایک مقالہ نگار نے یہ عندیہ دیا کہ نابینا شخص کے لئے شاعر ہونا ممکن نہیں اس کے خیال میں شاعری کا تعلق ذاتی تجربات سے ہوتا ہے اور تجربات کا تعلق "بینائی" سے۔ میرا خیال تھا کہ کوئی اور مقالہ نگار اس سوال کا جواب پیش کر دے گا لیکن ایسا نہ ہوا کیونکہ یہ بات مجھ جیسے معمولی شاعر کے بارے میں کہی گئی تھی اور کہنے والی شخصیت بھی قدرے بااثر تھی اس لئے کسی نے نوٹس نہ لیا۔ میں بھی کسی ایسے فورم کی تلاش میں تھا کہ جہاں اس رائے پر تبصرہ کرنے کا کوئی فائدہ ہو اسی رائے سے مماثل بہت سے حضرات مجھ سے اکثر و بیشتر یہ سوال کرتے ہیں کہ میں شاعری کس طرح کرتا ہوں اور جمالیاتی احساس کا ادراک مجھے کیوں کر ہوتا ہے۔ مجھے اکثر اس سوال پر حیرت ہوتی رہی ہے اور حال ہی میں ایک مضمون نگار نے میرے چند اشعار چن کر یہ فیصلہ دیا ہے کہ میں جمالیاتی حس سے بے بہرہ ہوں کیونکہ میں دیکھ نہیں سکتا۔ بادی النظر میں تو اس طرح کے سوالات اور خیالات باعث تعجب نہیں ہونے چاہئیں کیونکہ نابینا

حضرات سے متعلق عوام الناس نے ان گنت مفروضے قائم کر رکھے ہیں جن کے ابطال کی کوئی کوشش کی ہی نہیں گئی۔

جہاں تک نابینائی اور جمالیات کا تعلق ہے ہمیں چندبنیادی حقائق کو ملحوظ نظر رکھنا ہو گا' ہمیں جمالیات کا تعین کرنا ہو گا' ہمیں جاننا ہو گا کہ حسن کیا ہے اور شاعری کا حسن سے کیا رشتہ ہے۔ حسن کی تعریف ابھی تک ممکن نہیں ہو سکی کیونکہ اس کے متعلق نت نئی آراء سامنے آتی رہی ہیں لیکن اس سے پہلے کہ اس موضوع کو زیر بحث لایا جائے یہ امر کم و بیش متفقہ ہے کہ جمالیات کا تعلق کسی نے صرف آنکھ سے قائم نہیں کیا۔ زندگی میں ہر سمت حسن ہی حسن بکھرا پڑا ہے کائنات کو بنانے والا خود حسین ہے چنانچہ کائنات کیوں کر حسین نہ ہو گی اور یہ کائنات اس لئے بھی بنائی گئی ہے کہ اس کے حسن کو محسوس کیا جائے جس کے لئے حسن مطلق نے حواس خمسہ تخلیق کئے تاکہ حسن کا مکمل ادراک ہو سکے لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ کسی حد تک ہماری آنکھیں تو وا ہیں لیکن باقی تمام حواس مقفل ہیں اس لئے کائنات کا تمام حسن ہماری آنکھوں میں سمٹ آیا ہے سماعتیں مفلوج ہیں ذائقے لذت سے نا آشنا' قوت لامسہ خوابیدہ اور قوت شامہ بیکار ہماری آنکھیں اشیاء کے حسن میں ایسی الجھی ہیں کہ بس وہیں کی ہو رہی ہیں اور ہم نے دنیائے حسن پر عرصۂ حیات اتنا تنگ کر دیا ہے کہ اسے نسوانی حسن تک مختص کر ڈالا ہے لب و رخسار و کاکل سے متعلق شاعری ہی کو شاعری سمجھا جانے لگا ہے جہاں شاعری کی اتنی محدود دنیا ہو وہاں نابینا شاعر کے لئے جگہ بنانا مشکل ہو گا۔

اس سے پہلے کہ میں حسن کی تعریف پیش کرنے کی کوئی کوشش کروں، شاعری کے منصب سے متعلق تین بڑے شعراء کا ایک ایک شعر اپنے موقف کی وضاحت کے لئے پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

(میر)

نگہم نقب بہ گنجینہ دل ہا می زد
مژدہ باد اہل ریا را کہ ز میداں رفتم

(غالب)

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

(اقبال)

ان اشعار سے کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ بڑے شعراء زیر نظر موضوع پر کس طرح نظر ڈالتے ہیں اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ آنکھ کو ہی ادراک حسن و حقیقت کا ذریعہ نہیں سمجھتے ہمارے عہد کی بدقسمتی یہی رہی ہے کہ ہم نے آنکھ ہی کو سب کچھ سمجھ لیا اور اسی حوالے سے جمالیات کی تشریح کرنے لگے اور پھر شاعری کو بھی اسی ادنیٰ پیمانے پر ناپنے لگے۔ میں آنکھ کی جلوہ سامانیوں کا منکر نہیں لیکن میں صرف آنکھ ہی کو

شعری تحریک ماننے کے لئے قطعی تیار نہیں۔ ہمارے اکثر احباب کو تو سرے سے شعری مبادیات کا ہی علم نہیں۔ وہ نقد و نظر کے دبستانوں تک رسائی ہی نہیں رکھتے۔ میں ایسے حضرات کی سہولت کے لئے نقادان شعر و ادب کے چند اقوال پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

" Poetry is metrical composition, it is the art of uniting pleasure with truth by calling imagination to the help of reason, (Dr. Johnson) " What is poetry but the thoughts in words in which emotion spontaneously embodies itself."(J.S.Mill)

کار لائل نے شاعری کو "Musical Thought" کہا اور Shelley نے Expression of Imagaination

Hazlitt نے "Language of Imagination and passion"

Words worth نے "علم کی روح" اور Arnold نے "تنقید حیات"۔ ان تمام شعراء اور نقادان ادب نے شاعری کو بنیادی طور پر جذبے، تخیل، موسیقی وغیرہ سے مشروط کیا ہے اور ظاہری حسن کو کوئی ایسی اہمیت نہیں دی جیسے ہمارے بعض ناقدین اور شعراء نے، کیونکہ تمام تر حسن انکی آنکھوں میں سمٹ آیا ہے اور وہ بھی نسوانی حسن بقول شاعر مشرق۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ایک مشرقی نقاد نے تو غزل کا مطلب ہی عورتوں سے باتیں کرنا بیان کیا لیکن یاد رہے کہ باتیں کرنا نہ کہ ان کا سراپا بیان کرتے رہنا۔

چلئے اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ حسن سے مراد حسن ظاہری ہی ہے تو پھر حسن کی کیا تعریف ہے Keats نے کہا تھا۔

" Beauty is truth, truth beauty That is all ye know on the earth And all ye need to know."

جس کا ترجمہ میں نے اپنی ایک نظم "بیاد کیٹس" میں یوں کیا ہے۔

جبین وقت پر اپنے لہو سے
کسی خوشبو نے اک مصرع لکھا تھا
"صداقت حسن ہے حسن اک صداقت"
یہی مصرع مری روح غزل ہے
مری سوچوں کا دستور عمل ہے

کیٹس اپنے ایک خط میں یوں رقم طراز ہے

" What imagination seizes to be beautiful must be true."

گویا حسن ایک موضوعی (Subjective) حقیقت ہے گویا جو دل یا ذہن نے حسین گردانا' وہی حسین ہے

" Beauty is altogether in the eye of the beholder."

(General Few Wallace)

حسن باہر کہیں نہیں ہوتا
حسن اپنی نظر میں ہوتا ہے

Benjamin Franklin نے کیا خوبصورت بات کہی

"If Jack is in love he is no Judge of Jill's beauty"

Hume بھی حسن کو اشیاء کے اندر چھپی ہوئی شے بتاتا ہے چنانچہ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ حسن کوئی جامد و ساکت نظریہ نہیں بلکہ اس کے سوتے آنکھ کی بجائے دل سے پھوٹتے ہیں کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس کی محبوبہ مقابلہ حسن میں اول آئے گی لیکن وہ یہ ضرور جانتا اور مانتا ہے کہ وہی سب سے زیادہ حسین ہے۔

تو پھر کس حسن کی بات کرتے ہیں اور جمالیات سے مراد کیا لیتے ہیں کم سے کم ادراک رکھنے والے پر بھی یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ حسن احساس کا نام ہے' جذبوں کی قوس قزح کا نام ہے' احساسات کی کہکشاں کا نام ہے۔ علاوہ ازیں اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ بھی مان لیں کہ حسن کا ادراک آنکھ ہی کر سکتی ہے تو تب بھی نابینا شاعر اس سے محروم نہیں رہے گا کیونکہ اس کا شعور بھی اجتماعی شعور کا جزولاینفک ہے جو کچھ ماحول اور وراثت نے ایک بینا شاعر کو عطا کیا ہوتا ہے اس سے نابینا شاعر کیونکر محروم رہے گا۔ ہمارے بیشتر محسوسات ایمان اور یقین پر مبنی ہوتے ہیں۔ جن 'بھوت' پریاں کس نے دیکھے ہیں لیکن معاشرتی شعور کے باعث بہت سے ان کے وجود کا ادراک کر لیتے ہیں یہی صورت اس جمالیات کی ہو سکتی ہے

جس پر بعض بینا نقاد اور شعرا بضد ہیں حقیقت یہ ہے کہ ؎

ترے وجود کی نس نس سے آنکھ جھانکے گی
اگر ہے ذوق تماشا نظر کی بات نہ کر

نابینا طلبا کے چند امتحانی مسائل

بحمداللہ آج کم و بیش ہر درجے کے امتحان میں کوئی نہ کوئی نابینا امیدوار امتحان دیتا نظر آتا ہے کیونکہ اب ایسے سوال کرنے والوں کی تعداد کم از کم تعلیم یافتہ حلقوں میں قدرے کم ہونے لگی ہے جن کا خیال ہے کہ "آخر نابینا پڑھ کر کریں گے کیا؟"

اب یہ رجحان فروغ پا رہا ہے کہ بعض والدین بھی اپنے نابینا بچوں کی تعلیم کی افادیت کے ایک حد تک قائل ہونے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ثانوی، اعلیٰ ثانوی، بی اے اور ایم اے امتحانات میں بھی کوئی نہ کوئی نابینا امیدوار ضرور شریک ہوتا ہے۔ یہ بات انتہائی حوصلہ افزا ہے لیکن چند روز پہلے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں اپنے کسی دوست سے اپنے ایک نابینا ساتھی کا تعارف کرانے لگا اور بتایا "دیکھئے جناب انہوں نے بی اے میں درجۂ اول میں امتحان پاس کر لیا ہے" وہ دوست فرمانے لگے "دو آدمیوں کی ہمت جو ہوئی" میں نے کہا آپ کا کیا مطلب ہے؟ وہ صاحب فرمانے لگے "ایک تو ان کی اپنی ہمت اور ایک ان کے لکھنے والے کی" میرے لئے اس طرح کے خیالات کوئی نئے نہ تھے کیونکہ ایسی شکایات اکثر سننے میں آتی رہی ہیں اور جب کم و بیش سارا

معاشرہ ہی ایک حد تک بدعنوانیوں کا شکار ہو اور جہاں ڈگریاں حاصل کرنے کے نت نئے طریقے ایجاد ہونے کی گفتگو سننے میں آتی ہو وہاں نابینا طلباء کا کسی ایسی صورت حال سے دوچار ہونا بظاہر کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ نابینا بھی اسی معاشرے کے فرد ہیں اور معاشرے کی تمام اچھائیوں برائیوں میں حصہ دار سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن نابینا برادری کی بات قدرے مختلف ہے کیونکہ بینا حضرات کے برعکس ان کا عمل نمائندہ عمل تصور کیا جاتا ہے۔ نابینا حضرات کو خدا اور اپنے ضمیر کے خوف کے ساتھ ساتھ اپنی برادری کی ساکھ کے ختم ہوجانے کے خوف سے بھی ہر لغزش کے خلاف سینہ سپر رہنا چاہئے۔ انہیں اپنا کردار غیر معمولی طور پر بے داغ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے کیونکہ صدیوں کے معاشرتی رویوں سے پہلے ہی ان کا ناقابل تلافی نقصان ہوچکا ہے۔

بہرکیف صورت حال جو بھی ہو اسے بہتر بنانے کی اشد ضرورت ہے

یہ وضاحت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ نابینا امیدوار اپنے امتحانی پرچے ایک مخصوص طریقہ کار سے حل کرتے ہیں انہیں اپنی امتحانی قابلیت سے کم قابلیت کا تحریر کرنے والا (Amanuensis) مہیا کیا جاتا ہے۔ اگر نابینا امیدوار بی اے کا امتحان دے رہا ہو تو اسے ایف اے پاس تحریر کرنے والا دیا جاتا ہے وہ سوالات پڑھتا ہے اور نابینا امیدوار اسے پرچہ تحریر کرواتا ہے۔ اس کے لئے عام طور پر ایک الگ کمرہ مختص ہوتا ہے جہاں ایک نگران تعینات کردیا جاتا ہے۔ درحقیقت تحریر دینے کا عمل ہی کتنا مشکل کام ہوسکتا ہے۔ جس کے لئے غیر معمولی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ

نابینا امیدوار اس قسم کی کوئی مہارت نہیں رکھتا۔ تحریر کرنے والا جسے ہم آسان لفظوں میں رائٹر کہہ سکتے ہیں کم قابلیت کا ہوتا ہے چنانچہ اسے ہجے پوچھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ انگریزی کا پرچہ حل کرتے وقت تو سپیلنگز بار بار پوچھنے کی ضرورت پڑتی ہے اور اس طرح تسلسل ٹوٹ جاتا ہے جب کوئی نابینا امیدوار لکھوا رہا ہوتا ہے تو یقیناً ایک خیال کی رو اس کی ہمسفر ہوتی ہے اور بار بار سپیلنگ پوچھنے پر یا اسی طرح کی بہت سی ہدایات حاصل کرنے پر بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لکھنے والے کا اپنے قلم سے براہ راست تعلق ہوتا ہے اور ذہن اور قلم بیک وقت بر سر عمل ہوتے ہیں لیکن نابینا امیدوار کے لئے صورت حال مختلف ہوتی ہے۔ میں نے جب ۱۹۶۱ء میں میٹرک کا امتحان دیا تو اس وقت امتحانی اداروں کو ان مشکلات کا مطلقاً احساس نہ تھا۔ چنانچہ مجھے بے پناہ مسائل سے دو چار ہونا پڑا اور ایف اے کے امتحان کے دوران تو یہ مسائل اور بھی بڑھ گئے کیونکہ اس درجہ میں لکھوانے کے لئے بہت کچھ ہوتا ہے بہرحال مجھے تمام مشکلات کا خمیازہ بھگتنا پڑا — اور پھر میں نے ارباب بست و کشاد کی توجہ ان مشکلات کی طرف دلانا شروع کی۔ اخبارات نے تعاون کیا انہی دنوں لاہور بورڈ کی کمیٹی پر جناب لطیف صاحب بھی موجود تھے جن سے ہمارے خاندانی مراسم تھے۔ انہوں نے صورت حال کی پیچیدگی اپنے احباب تک پہنچائی اور لاہور بورڈ نے نابیناؤں کے لئے عام امیدواروں سے 45 منٹ زیادہ دینے کا فیصلہ کرویا چلئے مجھے نہ سہی میرے بعد اب تک نجانے کتنے نابینا امیدوار اس سے مستفید ہوئے ہونگے۔ لیکن میرا مسئلہ جوں کا توں رہا۔ مجھے بی اے کا

امتحان دینا تھا اور پنجاب یونیورسٹی کے قوانین میں ابھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور وہاں کوئی میری آواز سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ میں نے تمام تر دلائل پیش کرتے ہوئے اپنی درخواست اس وقت کے وائس چانسلر جناب پروفیسر حمید احمد کی خدمت میں پیش کی لیکن میں انہیں قائل نہ کرسکا اور انہوں نے اپنی نارضا مندی تحریر کرکے یہ درخواست سنڈیکیٹ کو بھجوا دی نتیجہ ظاہر تھا۔ اتنے میں جیسے تیسے میں نے بی اے پاس کرلیا اور اب مجھے ایم اے انگریزی کا امتحان دینا تھا لیکن اس مرحلے پر بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی لیکن امتحان دینے کے فوراً بعد اس وقت کے گورنر جناب موسیٰ خان کو درخواست گزارنے کا موقع حاصل ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ کسی مہربان نے ان سے میرا تعارف بھی کروا دیا چنانچہ یہ نہ صرف یونیورسٹی نے امتحانی وقت میں نابینا امیدواروں کے لئے آدھ گھنٹے کا اضافہ کردیا بلکہ گورنر موصوف نے مجھ میں دلچسپی لینا شروع کردی اور جونہی میں نے ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کیا میری ملازمت کا مسئلہ بھی حل ہوگیا اور حکومت نے ملازمتوں کے Medical Fitness قانون سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔

لیکن وقت میں اضافے کی رعایت کے باوجود نابیناؤں کے لئے امتحانی طریقہ کار میں واضح مشکلات موجود ہیں کہا جاتا ہے کہ موجودہ طریقہ امتحانات ذہین اور محنتی طلباء کے لئے غیر مفید ہے اور کمزور اور نالائق طلباء کے لئے مفید۔ ایسی شکایات سننے میں آتی رہی ہیں۔ یہ شکایات درست ہوں یا غلط کسی ایسے طریقہ کار کی تلاش کی جانی چاہئے جس سے سرے سے کوئی ایسا امکان ہی پیدا نہ ہو کہ کسی کو شکایت کرنے کا موقع ہاتھ آئے۔

یورپ کے ممالک میں نابینا امیدواروں کو ٹائپ رائٹر استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے اور اس طرح وہ اپنی قابلیت کا صحیح صحیح اظہار کرپاتے ہیں لیکن اس طریقہ کار پر ہمارے ہاں بہت سے اعتراضات کئے جاتے ہیں یہ کہ پہلے نابینا امیدوار ٹائپ کرنا سیکھے اور یہ کہ ٹائپ میں بعض اوقات غلطیاں بھی ہوجاتی ہیں اور ایسا معلوم ہو جاتا ہمارے جذبہ ترحم سے سرشار ممتحنین کو ثواب کمانے کا نادر موقع فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ جب تک ہم من حیث القوم یہ باور نہیں کرلیتے کہ ہمیں صرف اور صرف انصاف سے کام لینا چاہئے کیونکہ معاشرتی بقاء اسی پر منحصر ہے تو اس وقت تک ایسی خرابیاں موجود رہیں گی اور معاشرتی ڈھانچے کو کمزور کرتی رہیں گی بہرحال ایسا ممکن ہے کہ علم کی روشنی پھیلے اور اس طرح کے غلط تاثرات از خود ختم ہوجائیں اور نابینا حضرات ٹائپ پر امتحان دے سکیں اور جو اغلاط ممکنہ طور پر ٹائپ رائٹر کی وجہ سے ہوسکتی ہیں ان سے صرف نظر کیا جائے اور ایک نابینا امیدوار ٹائپ سیکھنے کو اس امر پر ترجیح دے کہ سرے سے اس کی قابلیت ہی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائے یا کم از کم نالائق طلباء کی حوصلہ شکنی ہو۔

طریقۂ امتحان کے سلسلے میں ایک یہ تجویز بھی سامنے آئی کہ نابینا امیدوار کو ٹیپ ریکارڈ مہیا کی جائے جس پر وہ بول کر اپنے پرچے حل کرے۔ گو اس میں بھی وہی غلط احساس ترحم کا شائبہ موجود رہتا ہے لیکن اس سے ٹائپنگ سیکھنے کی ضرورت ختم ہوجاتی ہے۔ رہی سپیلنگ کی آزمائش کی بات تو اس کے لئے زبانی انٹرویو کا سلسلہ بھی شروع کیا جاسکتا

ہے ایک تجویز یہ بھی ہے کہ نابینا امیدوار کو پیپر بریل میں مہیا کیا جائے اور وہ بریل میں حل کرے پھر یہ پرچہ جات نابینا اساتذہ کے پاس روانہ کر دیئے جائیں جن کی اب کمی نہیں ہے جہاں تک عام ٹائپ رائٹر یا بریل ٹائپ رائٹر مہیا کرنے کا سوال ہے اس کی ذمہ داری امتحان لینے والے ادارے پر ہونی چاہئے۔

بہرحال نابینا امیدواروں کے لئے طریقۂ امتحان کی تبدیلی پر غور کیا جانا وقت کی انتہائی اہم ضرورت ہے کیونکہ نابینا حضرات زیور علم و ہنر سے آراستہ ہونا چاہتے ہیں اور اس طریقے سے کہ ان کی طرف کوئی انگلی نہ اٹھے اور پھر وہ معاشرے میں اپنے جائز حقوق حاصل کر سکیں لیکن اس کے لئے خالص تعلیمی استعداد' شب و روز کی محنت اور بے داغ کردار کی کہیں زیادہ ضرورت ہے اور اس کے لئے نابینا برادری کو ہر طرح کا چیلنج قبول کرنے کی پوری صلاحیت پیدا کرنا ہوگی۔

نابینا طلباء اور بریل کتب کی فراہمی

کیا آپ کسی سکول' کالج یا یونیورسٹی کے طلباء کا تصور کرسکتے ہیں جو کتب کے بغیر تعلیم حاصل کر رہے ہوں لیکن یہ معجزہ نابینا طلباء سے بیسویں صدی کے اس آخری عشرے میں آج بھی سرزد ہو رہا ہے عین ممکن ہے کہ بہت سے بینا دوستوں کے لئے یہ معجزہ سرے سے معجزہ ہی نہ ہو کیونکہ ان کے خیال میں نابینا پیر فقیر جانے کیا کیا معجزات سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ تو ایسا معجزہ ان سے کیا بعید ہے اور پھر یہ کہ نابینا تو پیدائش ہی سے "حافظ صاحب" ہوتے ہیں اس لئے بھی کہ بینائی کے عوض انہیں بلا کا حافظہ مل جاتا ہے۔ تو اس میں کیا مضائقہ ہے کہ وہ پچاس' سو کتابیں حفظ کرلیں لیکن وہ لوگ جو بیسویں صدی کے شعور سے بہرہ یاب ہیں اور جن کے حواس معمول کا کام کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ نابینا حضرات بھی عام لوگوں کی طرح معجزے سرانجام نہیں دے سکتے اور اس لئے بریل کی کتب کے ذریعے پڑھتے لکھتے ہیں بریل ابھرے ہوئے لفظوں کا ایک نظام تحریر ہے جسے فرانس کے ایک نابینا نے ہی ایجاد کیا تھا اور اس نظام کے باعث نابیناؤں کے لئے بظاہر خوش بخت ممالک میں کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے پاس ایسی کتابوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔

جنہیں وہ فالتو گندم کی طرح فالتو سمجھ کر ہمارے ممالک کو ارسال کرنے میں کبھی کوئی پس و پیش محسوس نہیں کرتے اور وہ کتب ہمارے ڈاک خانے سے ٹرالیوں کے ذریعے نابیناؤں کے لئے اداروں کو پہنچائی جاتی ہیں لیکن بدبختی دیکھئے کہ وہ ہمارے کسی کام کی نہیں ہوتیں کیونکہ وہ انگریزی میں ہوتی ہیں اور انگریزی بھی ایسی کہ جسے سمجھنے کی لئے سالہا سال یہ زبان سیکھنی پڑے۔ ایسے ممالک اپنے نصاب کے مطابق کتب تیار کرتے ہیں بلکہ وہاں تو ہر وقت مل سکتی ہیں چنانچہ ہمارے نابینا طلباء اس غیر ملکی فیاضی سے بھی استفادہ نہیں کرسکتے اور انہیں آج سے سو سال پہلے کے طریقۂ کار کے تحت کچھ مختصر نوٹس بریل کے فریم کے ذریعے لکھنا پڑتے ہیں اور اگر ایک صفحہ اس فریم پر لکھنا ہو تو کم و بیش تین چار گھنٹے صرف ہوتے ہیں اور ہاتھ تھک کر چور ہوجاتا ہے اب بریل لکھنے کے لئے پرکن بریلر استعمال ہوتا ہے لیکن اس کی قیمت کوئی سولہ ہزار روپے ہوتی ہے جس کے خریدنے کی استطاعت کسی نابینا کو عام حالات میں ہو ہی نہیں سکتی۔ اب تو ایک ایسی مشین بھی ایجاد کرلی گئی ہے جس پر عام کتاب لگائیے اور انگلی سے چھو کر پڑھ لیجئے۔ اس مشین کو OPTICONE کہتے ہیں جس کی قیمت کوئی دو لاکھ روپے ہے اور جس پر ٹریننگ کے لئے ملک سے باہر جانا پڑتا ہے ہمارے علم کے مطابق ایک دو OPTICONE پاکستان کے بعض اداروں میں ہیں۔ لیکن وہ صرف اس وقت ظاہر ہوتی ہیں جب انہیں کسی کو دکھانا ہو کہ دیکھئے نابیناؤں کے لئے ایسی مشینیں بھی ایجاد ہوگئی ہیں۔ ٹھہریئے! ہم نے سنا ہے کہ اب تو ایسی مشین بھی موجود ہے جس میں عام لکھائی کی

کتاب فٹ کیجئے اور وہ آپ کو پڑھ کر سنا دے گی لیکن اس کی قیمت "ہماری قیمت سے بھی کہیں زیادہ ہے" لاکھوں روپے۔ اسے CURSWEEL کہتے ہیں۔ چھوڑیئے بڑے ممالک کی باتیں بڑے ممالک تک ہی رہنے دیجئے۔ ہمارے ملک میں بہرحال بریل فریم ہی ابھی تک ہمارا نجات دہندہ ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا ہے کہ اب ہمارے طلباء ٹیپ ریکارڈر کا استعمال کرنے لگے ہیں لیکن اس کے لئے ٹیپ ریکارڈر' کیسٹوں کی خریداری اور کسی پڑھ کر سنانے والے کی دریا دلی ضروری ہے اور پھر یہ کہ اس طرح نابینا حضرات صرف سن کر گزارا کریں گے۔ ہجے اور دیگر لوازمات سے واقف نہیں ہوسکیں گے اور پھر کیسٹیں کسی طرح بھی کتابوں کا نعم البدل نہیں ہوسکتیں۔ رضاکار تنظیمیں کچھ خدمت ضرور سرانجام دے رہی ہیں کہ وہ ایک مشین جسے بریل ڈپلیکیٹر کہتے ہیں کے ذریعے کتابیں تیار کرتی ہیں یہ ڈپلیکیٹر کوئی اسی ہزار روپے میں دستیاب ہوتا ہے جس میں کچھ پلیٹیں ہوتی ہیں جن میں ہندسوں کے ذریعے لکھ دیا جاتا ہے اور پھر سائیکلو سٹائل کے طریقے سے کاپیاں تیار کی جاسکتی ہیں لیکن اس میں استعمال ہونے والے ٹائپس (یعنی ابھارنے والا مواد) بہت جلد ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور انہیں سات سمندر پار سے منگوانا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے لئے جو مخصوص کاغذ ہوتا ہے وہ بھی ہمارے "پیارے ملک" میں دستیاب نہیں اور طوعاً" و کرہاً" "ایوری پیپر" استعمال کیا جاتا ہے جس کی قیمت اکثر آسمان سے باتیں کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور پھر اس کی عمر دراز ہماری طرح چار دن کی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ طریقہ کار بھی زیادہ مفید

نہیں۔ تو پھر کتابوں کی فراہمی کا کیا انتظام ہو۔ اس کے لئے ہماری حکومت نے دو بریل پریس قائم کر رکھے ہیں۔ ایک بہاولپور میں اور ایک کراچی میں۔ بہاولپور کا پریس تو نیم جان کیفیت میں پایا گیا۔ کچھ دیر کے لئے صحت مند رہا اور اب پھر بیمار ہے اور بیمار چڑ چڑا ہو جاتا ہے اور پھر چڑچڑے سے بات کرنے کا یارا کسے؟ چند بریل کتب اس پریس سے دستیاب ہوتی رہیں لیکن اب وہاں کی کوئی خبر نہیں۔ کراچی میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کی طرف سے ایک پریس قائم ہے جس نے کوئی آٹھ دس کتابیں شائع کی ہیں۔ ایسی صورت حال کا کیا مداوا ہو' خدا سے دعا ہی کی جاسکتی ہے سو ہم کرتے رہتے ہیں دعا یہ بھی ہے کہ خدا ہمارے ارباب اقتدار کو یہ توفیق دے کہ وہ اس صورت حال کا جلد از جلد جائزہ لیں وگرنہ کروڑوں روپے سے قائم شدہ سکول جن کا جال حکومت سپیشل ایجوکیشن کے ذریعے سے پھیلا رہی ہے کا کیا فائدہ ہوگا؟ نابینا طلباء کو خوبصورت عمارتوں کی ضرورت نہیں' انہیں تو کتب اور دیگر بریل کے سامان کی ضرورت ہوتی ہے مخصوص تعلیم کے ارباب بست و کشاد اس نازک صورت حال سے ضرور واقف ہونے چاہئیں کیونکہ انہوں نے آنکھیں ہوتے ہوئے "بے آنکھ والوں" کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے۔

نابینائی ایک نعمت؟

نابینائی پر گفتگو کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ جو آپ کی طرح مجھے بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کے ساتھ سمجھوتہ کئے بغیر نہیں بن سکتی اور یہ بھی سنتے آئے ہیں اور بڑی حد تک درست بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولیٰ کے ہر کام میں کوئی حکمت ہوتی ہے۔ بہرکیف میری اکثر و بیشتر ایسے حضرات سے ملاقات ہوتی رہتی ہے جو مجھے باور کراتے رہتے ہیں کہ نابینائی ایک نعمت ہے کوئی کہہ اٹھتا ہے "دیکھئے جی آپ خدا کا شکر ادا کریں کہ آپ دیکھ نہیں سکتے جانے کتنے گناہوں سے بچ گئے ہیں۔ آنکھ سے ہر لحہ گناہ سرزد ہوتے ہیں آپ تو اس سے محفوظ ہیں نا" کئی بار بہت سے حضرات کو یہ کہتے سنا ہے کہ "نابینائی ایک بہت بڑی نعمت ہے دیکھئے نابیناؤں کا حافظہ کتنا مضبوط ہوتا ہے جانے کیا کیا انہیں یاد رہ جاتا ہے ان کا حافظہ نہیں کمپیوٹر ہوتا ہے جو اللہ نے آنکھوں کے بدلے ان کے دماغ میں فٹ کر دیا ہوتا ہے۔" میری شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کئی احباب نے فرمایا کہ "وہ آنکھیں جو اندر کھلتی ہیں" گویا میری بیرونی آنکھیں خلاق اعظم نے باہر سے نکال کر اندر لگا دیں اور بعض حضرات تو یہاں تک سوچتے ہیں کہ جب

بینائی چھن جاتی ہے تو دل روشن ہوجاتا ہے اور ورڈز ورتھ کے طفل شیر خوار کی طرح نابینا ایک بہت بڑا فلسفی اور دانائے حقیقت بن جاتا ہے۔ اس پر بڑے بڑے حقائق منکشف ہونے لگتے ہیں اور وہ ہماری تقدیروں کے حال بھی بتا سکتا ہے یہ تو وہ مفروضے ہیں جو بینا برادری نابیناؤں سے قائم کر لیتی ہے آیئے دیکھیں کہ خود نابینا حضرات بھی بعض اوقات اپنے بارے میں اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ جب میں کوئی آٹھ نو سال کی عمر میں بینائی سے بالکل محروم ہوگیا اور سارے چاند اور سورج میری دنیا سے نوچ لئے گئے اور میں اپنے آپ کو یکہ و تنہا محسوس کرنے لگا تو مجھے نابیناؤں کے لئے قائم لاہور میں ایک سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ میں وہاں بہت پریشان رہا کرتا تھا لیکن آہستہ آہستہ دل بہل گیا۔ میرے ایک نابینا دوست نے مجھے ایک دن کہا "یار اس سکول میں تو کوئی مزہ ہی نہیں' زندگی عذاب ہے آنکھیں چھن گئی ہیں اور پھر بھی کہتے ہیں کہ کرسیاں بننا سیکھئے' کتابیں پڑھیئے جب سکول میں نہیں تھا تو بڑے مزے تھے ہر کوئی ہمدردی کرتا تھا کسی طرح کا کوئی کام کرنے کے لئے نہیں کہتا تھا۔ گلیوں' بازاروں میں کوئی نہ کوئی ہاتھ میں کچھ نہ کچھ تھما کر چلا جایا کرتا تھا۔ بڑے مزے تھے یار" مجھے اس کی باتیں اچھی نہیں لگیں اور میں نے اپنے ایک نابینا استاد محترم سے سارا ماجرا کہہ ڈالا اور پھر انہوں نے اس موضوع پر مجھے وہ کچھ بتایا جو ساری زندگی میرے لئے مشعل راہ بنا رہا جس کی یہاں دوہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بہرحال نابیناؤں کے لئے اس سکول میں نابینا طلباء اپنے آپ کو نابینا نہیں سمجھتے تھے ہر وقت ہنستے کھیلتے رہتے' شور مچاتے'

شرارتیں کرتے' اٹکھیلیاں کرتے بعض نہ آتے' انہیں اس کا احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کسی حادثے سے دوچار ہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عام دنیا سے منقطع ایک (Arcadia) یا (Utopia) میں سانس لے رہے ہوتے تھے انہیں اس زندگی کو عام لوگوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملتا تھا' اس صورتِ حال کا ایک فائدہ ہوتا تھا کہ نابینائی کے بعد جو مایوسی اور سراسیمگی کے مہیب سائے زندگی پر محیط ہوجاتے ہیں اور انسان کی قوت عمل کو شل کردیتے ہیں چھٹ جاتے تھے اور نابینا بچے اپنی ابتلاء اور آزمائش کو بھول جاتے تھے اور عبوری دور کے لئے ایسا درست بھی تھا۔ اس سکول سے فارغ ہونے کے بعد بھی نابینا حضرات کو نابینائی کے گن گاتے ہوئے کئی بار سنا ہے۔ جب برقی رو منقطع ہوجاتی ہے اور ہر جگہ اندھیرا ہی اندھیرا مسلط ہوجاتا ہے تو ہمارے نابینا دوست کہہ اٹھتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے ہم پر اس اندھیرے کا کوئی اثر نہیں ہم اپنی کتابیں پڑھ سکتے ہیں لکھ سکتے ہیں اور تمام زندگی کے مشاغل بدستور ادا کرسکتے ہیں اس لئے چلئے ہمیں کچھ تو فائدہ ہے۔

میں نے صرف ایسے امور کی طرف توجہ دلائی ہے جن کا حقیقت سے بہت کم تعلق ہے کبوتر اگر اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہے تو بلی کا خطرہ ٹل نہیں جاتا۔ ہم لاکھ کہتے ہیں کہ نابینائی ایک نعمت ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے'ایک بہت بڑی مشکل ہے ہمیں مشکلات کا صحیح ادراک کرنا ہوگا تبھی ان سے کماحقہ نبرد آزما ہونا ممکن ہے اس میں کلام نہیں کہ مشکلات اور آزمائشیں اکثر و بیشتر خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کردیتی

ہیں اور عظیم لوگ بدترین حالات میں بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں بقول علامہ اقبال ۔

خطر تاب و تواں را امتحان است
عیار ممکنات جسم و جان است

اور اسی حقیقت کا اظہار شیکپیئر کا ایک کردار یوں کرتا ہے۔

"Sweet are the uses of adversity"

یعنی دکھ' پریشانیاں اور مسائل روح فرسا ضرور ہوتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر ان سے دو چار ہونے کے بعد ان سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ تاریخ کا سینہ ایسے کارناموں سے روشن ہے جو انتہائی نامساعد حالات میں سرانجام دیے گئے اور یہی کیفیت افراد کی زندگی میں ہوتی ہے۔ اس سیاق و سباق میں نابینائی بڑی حد تک نعمت ثابت ہو سکتی ہے شیکپیئر کے ایک کردار کی آنکھیں نکال دی جاتی ہیں اور اس وقت اس پر یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ

"I toumbled when I saw"

ملٹن کوئی پینتالیس سال کی عمر میں بینائی کھو بیٹھتا ہے اور انتہائی افسردگی کے عالم میں خدا سے سوال کرتا ہے کہ اے مولیٰ اب میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیسے کروں گا جو تو نے مجھے ودیعت کی ہیں اور جن کا حساب مجھے لازماً دینا ہوگا اور آخر میں یہ کہہ کر اپنے دل کو اطمینان دلاتا ہے۔

"They also serve who only stand and wait"

لیکن نہ اسے معلوم تھا اور نہ کسی اور کو کہ نابینائی اس کی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دے گی کیونکہ وہ اپنے ذہنی امکانات کو تلاش کرنے میں اور بھی زیادہ منہمک ہوجائے گا اور پھر (Paradise Lost) جیسی معرکتہ الآرا رزمیہ کہہ کر حیات جاوید حاصل کرلے گا۔

اس اعتبار سے تو نابینائی یا کوئی اور معذوری نعمت ضرور ہوتی ہے مگر ان کے لئے جو مشکلات کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال دیتے اور مشکلات کے سمندر میں مردانہ وار غوطہ زن ہو کر گوہر مراد حاصل کرلیتے ہیں۔ رہے وہ مفروضے اور توہمات جن کا ذکر میں نے آغاز میں کیا ان سے حقیقت کا کوئی تعلق نہیں بینائی چھن جانے سے کوئی غیر معمولی صلاحیت کبھی از خود نازل نہیں ہوتی کوئی نابینا کسی طرح کا محیرالعقول کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا اس طرح کے تصورات سے تو محنت کی توہین ہوتی ہے جہد حیات کے تمام جذبات سرد پڑ جاتے ہیں قوت عمل مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے زندگی بذات خود ایک بہت بڑا چیلنج ہے اور نابیناؤں کے لئے یہ چیلنج اور زیادہ چیلنج بن جاتا ہے۔

معذوری اور معاشرتی ذمہ داریاں

معذورین سے متعلق چند خوفناک اعداد و شمار باشعور دنیا کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج ہیں اور یہ احساس دلانے کے لئے یہ حقائق پوری توجہ کے مستحق ہیں۔ اگرچہ یہ اعداد و شمار بہت سائنٹیفک تو نہیں لیکن اقوام متحدہ کے مختلف اداروں کی انہیں توثیق حاصل ہے شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ دنیا کی آبادی کا ۱۰ فی صد حصہ معذورین پر مشتمل ہے پندرہ سال کی عمر تک کے ایک ارب چار کروڑ بچوں میں سے ۱۴ کروڑ معذور ہیں۔ اور ان میں ۸۰ فیصد ترقی پذیر ممالک میں موجود ہیں۔ ۲۰۰۰ء تک ترقی پذیر ممالک میں ان بچوں کی تعداد ۱۹ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ یہاں یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ دنیا کی آبادی کا کوئی ۲ ٪ نابیناؤں پر مشتمل ہے۔

ان اعداد و شمار کی روشنی میں ہر ذی شعور یہ محسوس کرنے پر مجبور ہے کہ اتنے بڑے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری دنیا کو اپنے تمام تر وسائل صرف کرنا ہوں گے۔ دنیا کا ۱۰ ٪ فیصد معذوری کی لپیٹ میں آجانے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ معذوری کی اس آسیب کا مقابلہ کرنے کی خاطر خواہ کوشش نہیں کی گئی بلکہ اسے اللہ کی مرضی سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا اور یہ سمجھ کر کہ دنیا کے پاس اتنے وسائل ہی کہاں ہیں کہ معذوری کا مقابلہ کیا جاسکے۔ معذوری کی

اقسام میں بہرا پن' گونگا پن' نابینائی' جسمانی معذوری اور ذہنی معذوری شامل ہیں اور بعض اوقات بہت سی معذوریاں ایک ہی شخص کو بھی لاحق ہوجاتی ہیں جس سے مسائل کہیں زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ اس مسئلے کے دیگر پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے معذوری کا مفہوم واضح کردینا ضروری ہے معذوری سے مراد ایسی صورت حال ہے جب کوئی فرد ذہنی یا جسمانی ناکارہ پن کی وجہ سے عام زندگی گزارنے کے قابل نہ رہے اس کے معمولات متاثر ہوجائیں اور وہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال نہ کرپائے یا انہیں کرنے کے لئے اسے بعض دیگر ذرائع اختیار کرنے پڑیں۔

معذوری کی بہت سی وجوہات بیان کی جاسکتی ہیں جیسے غیر متوازن اور ناخالص خوارک یا ضروری خوارک کی عدم فراہمی' بڑھاپا' بعض پیشہ ورانہ معمولات' بیماریاں' حادثات' پیدائش کے وقت ضروری احتیاطی اقدام کا فقدان' صحت کی بنیادی سہولیات کی عدم فراہمی' صحت کے اصولوں سے ناواقفیت وغیرہ۔

جہاں تک نابینائی کا تعلق ہے یہ بذات خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ایشیا میں کوئی ڈھائی لاکھ بچے وٹامن اے کی کمی کی وجہ سے ہر سال بینائی کھو بیٹھتے ہیں خود ہمارے ملک میں نابیناؤں کی تعداد بعض اندازوں کے مطابق ۶ لاکھ سے ۱۲ لاکھ تک ہے اگرچہ صحیح اعداد و شمار حاصل کرنے کا کوئی طریقہ وضع نہیں کیا گیا۔ تاہم بعض رضاکارانہ تنظیموں نے اس سلسلہ میں اندازے لگانے کی کوششیں کی ہیں۔ ہمارے ہاں نابینائی ایک خوفناک صورت اختیار کر چکی ہے۔ ملک کے کسی حصہ میں آنکھوں کے امراض کے علاج کا کوئی انتظام نہیں اور پھر نہ ہی ان اصولوں پر عمل کیا جاتا ہے جو بینائی کے تحفظ کے لئے ضروری ہیں۔ چنانچہ

نابیناؤں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے نابینا ہونا تو ایک مسئلہ ہے ہی لیکن نابینائی کے بعد جو ردعمل ہمارے معاشرے میں دیکھنے میں آتا ہے اس سے نابینائی اور بھی خوفناک صورت اختیار کر لیتی ہے ضروری یہ ہے کہ معذوری کو محض ایک حادثہ سمجھا جائے اور اس کی روک تھام کے طریقے دریافت کئے جائیں اور جب یہ مسئلہ پیدا ہو ہی جائے تو اس کے اثرات کو کم سے کم تکلیف دہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ بعض اوقات معذورین کے بارے میں بے پرواہی کا طرز عمل اختیار کر لیا جاتا ہے ماہرین کا خیال ہے کہ معذورین کو بنیادی سہولتیں مہیا نہ بھی کریں تب بھی ان پر مالی اخراجات اسی قدر اٹھ جاتے ہیں اور پھر یہ کہ اگر انہیں فعال بنا دیا جائے اور علم و ہنر کی دولت سے آراستہ کردیا جائے تو وہ خود قوم کے لئے ایک اقتصادی اکائی بن جاتے ہیں اور قومی فلاح و بہبود میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتے ہیں ضرورت مسائل سے گھبرا جانے کی نہیں بلکہ ان کا سائنٹیفک خطوط پر تدارک کرنے کی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں معذورین کو ضروری تعلیم و تربیت دے کر بھرپور زندگی گزارنے کے قابل بنا دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی اس طرح کی چند ایک مثالیں ملنے لگی ہیں کہ معذورین نے اپنی معذوری کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ اپنی باقی ماندہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر قومی دھارے میں شامل ہوگئے اور قومی ترقی میں اپنا کردار ادا کرنے لگے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سالہا سال کے قائم کردہ مفروضات کو خیرباد کہا جائے اور جدید دور کے حقائق کو تسلیم کر لیا جائے اور وہ حقائق یہ ہیں کہ ضروری تعلیم و تربیت کے بعد ایک معذور دیگر شہریوں کی طرح خدمات انجام دے سکتا ہے

اور اپنی معذوری پر قابو پاسکتا ہے معذورین معاشرے کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج ہوسکتے ہیں۔ وہ بھکاری بن کر معاشرتی تفاخر کو ملیا میٹ کرسکتے ہیں اور ان معذورین کے لئے مشکلات پیدا کرسکتے ہیں جنہوں نے باعزت زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہوتا ہے یہ معذوری چھوت کی بیماری کی طرح پھیل بھی سکتی ہے۔ جس کے شواہد ہمارے سامنے ہیں معذورین کو ہاتھ پھیلاتے دیکھ کر کئی تندرست و توانا افراد بھی کشکول گدائی کو ہاتھ میں لئے جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ اگر ہمیں معذورین کو باعزت زندگی گزارنے کے قابل بنانا ہے تو ہمیں اس یقین سے کام شروع کرنا ہوگا کہ انسان کو قدرت نے بے پناہ صلاحیتیں دی ہیں اگر کچھ صلاحیتیں چھن بھی جائیں تو باقی صلاحیتوں کو زیادہ توانائی سے بروئے کار لا کر ان کی کمی کو پورا کیا جاسکتا ہے مگر اس کے لئے قوم کو اپنے رویوں میں بنیادی تبدیلیاں لانا ہوں گی۔

نابیناؤں کے مسائل اور اُنکے منتظمین

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ نابینا حضرات کو عام طور پر اس ترقی یافتہ دور میں بھی قائدانہ اور انتظامی صلاحیتوں سے عاری تصور کیا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ کوئی یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ بینائی کے بغیر بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ "آنکھیں گئیں جہان گیا" ایک مسلمہ حقیقت سمجھی جاتی تھی اور کسی کو یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ بینائی سے محروم افراد زندگی میں ضروری تعلیم و تربیت کے بعد اسی قدر اہم کردار ادا کرسکتے ہیں جس قدر کہ بینائی کی دولت سے مالا مال لوگ۔ لوگ یہی سمجھتے تھے کہ بینائی کے بغیر زندگی ہی نہیں جب میں بینائی سے محروم ہوگیا تو مجھے میرے اپنے رشتہ دار باور کرانے کی کوشش کیا کرتے تھے کہ بینائی کے بغیر زندگی محال ہے "لوگ تو تمہارے آگے کا کھانا اٹھا لے جائیں تو تمہیں معلوم تک نہ ہو" ان حضرات کا تجربہ انہیں اس طرح کی آراء قائم کرنے پر مجبور کرتا تھا اس لئے وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک نابینا معمول کی زندگی گزار سکتا ہے لیکن گذشتہ سالوں میں حیرت انگیز تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر طہٰ حسین بچپن ہی سے نابینا تھے۔ با ایں ہمہ مصر کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے اپنے فرائض حیرت انگیز خوش اسلوبی سے

سرانجام دیتے رہے اور آہستہ آہستہ کم از کم یورپ میں فکر کی تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ کوئی سن باسٹھ تریسٹھ کی بات ہے جب میری ملاقات امریکہ کی ایک نابینا خاتون ڈاکٹر ایزابل ایل ڈی گرانٹ سے ہوئی وہ خاتون کیا تھیں! خود اعتمادی اور عزت نفس کا مجسمہ تھیں۔ میری ان سے ملاقات انار کلی میں ان کے دفتر میں ہوئی میں ان دنوں گورنمنٹ کالج سرگودہا میں سال سوم کا طالب علم تھا انہوں نے مجھے بتایا کہ امریکہ میں پروفیسر ٹین گروپ جیسے حضرات نے نابیناؤں سے متعلق نقطہ نظر تبدیل کرنے میں گراں بہا کردار ادا کیا۔ انہوں نے بتایا کہ پاکستان میں نابیناؤں کی حالت زار کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کے مسائل حل کرنے میں ذمہ داری ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جنہیں سرے سے علم ہی نہیں کہ نابیناؤں کے اصل مسائل ہیں کیا؟

انہوں نے کہا

"Only the wearer knows where the shoe pinches"

ان کے خیالات نے مجھ میں ایک انقلابی سوچ پیدا کرنے کی داغ بیل ڈالی۔ ڈاکٹر ایزابل نے نابینا ہونے کے باوجود اپنے ساتھی "سفید چھڑی" کے ہمراہ ساری دنیا کا سفر کیا اور واضح کیا کہ صرف نابینا ہی اپنی مشکلات کو سمجھتے ہیں اور ان کی وکالت کرسکتے ہیں ان کی کوششوں سے ہی پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ کی بنیاد رکھی گئی۔ ڈاکٹر موصوفہ سے اس کے بعد بھی ملاقاتیں رہیں اور انہوں نے اپنی وفات سے ایک مہینہ پہلے بھی مجھے خط لکھا۔ ان سے ملاقاتیں اور خطوط میرے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوئے اور اس طرح میں نے یہ محسوس کیا کہ

نابیناؤں کو متحد کرکے اپنے مسائل خود حل کرنے چاہئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے اہل علم و دانش کو یقین نہیں آیا کہ نابیناؤں میں قائدانہ اور انتظامی صلاحیتوں کی کوئی کمی نہیں' مجھے یاد ہے کہ جب میں ایک دانشور سے اپنے موقف پر گفتگو کر رہا تھا تو انہوں نے بے ساختہ فرمایا تھا

"If a blind leads a blind both will fall into a ditch"

موصوف نہ بائبل سے واقف تھے اور نہ نابیناؤں کی صلاحیتوں سے۔ کیونکہ جو قول انہوں نے رقم کیا وہ بائبل میں ان حضرات کے لئے ہے جو بصارت تو رکھتے ہیں لیکن بصیرت سے محروم ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ دنیا بھر میں نابیناؤں کی ایسی تنظیمیں موجود ہیں "جو اپنی مدد آپ" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے گراں بہا خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ڈاکٹرز کی نمائندگی ڈاکٹرز کرتے ہیں' انجینئرز کی انجینئرز اور اساتذہ کی اساتذہ ہر پیشے اور ہر سماجی گروہ کی اپنی تنظیم ہوتی ہے ہر فرد اور ہر گروہ اپنے مسائل کو بہتر سمجھتا ہے تو پھر یہ فرض کیوں کر لیا گیا کہ نابینا افراد اپنے مسائل کو حل ہی نہیں کرسکتے۔ پاکستان میں ایسے درجنوں ادارے ہیں جنہیں صرف اور صرف نابینا حضرات چلا رہے ہیں اور یہ ادارے گورنمنٹ کے قائم کردہ اداروں سے کہیں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے منصوبوں پر استعمال ہو رہے ہیں۔ اور ان منصوبوں کا انتظام و انصرام نابیناؤں کے پاس ہے۔

گزشتہ سالوں میں جب حکومت کو یہ احساس دلایا گیا کہ ان نابیناؤں کی

تعلیم و تربیت کا حکومتی سطح پر کوئی انتظام نہیں اور اس وقت کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم جنکی اپنی بیٹی معذور تھی کو یہ احساس بڑی شدت سے ہوا اور یقیناً انہوں نے حکومتی سطح پر گراں قدر کام کیا۔ لیکن ان کے ایوان تک نابینا قائدین کی آواز موثر انداز سے نہ پہنچ سکی انہوں نے سپیشل ایجوکیشن کا ایک ڈائریکٹریٹ قائم کردیا یقیناً اس منصوبہ بندی میں بیورو کریسی کا ہاتھ ہوگا۔ سپیشل ایجوکیشن کے احباب وہ تھے جو معذوری کے تجربے سے نہیں گذرے تھے انہیں کیا علم ہوسکتا تھا کہ سچ مچ معذورین کے کیا مسائل ہوتے ہیں نابینائی ہی کو لے لیجئے جب تک کوئی شخص خود اس تجربہ سے نہ گزرے اسے اس کا تجربہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ پرائمری سے لے کر یونیورسٹی کی سطح پر نابینا طلباء کے کیا مسائل ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کروڑوں روپے خرچ کئے جانے کے باوجود نہ تو صحیح طور پر بریل میں کتابیں موجود ہیں اور نہ نابیناؤں کے دیگر فنی آلات۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات لاکھ نیک نیت اور نیکو کار ہوں انہیں سنی سنائی باتوں پر یقین کرنا پڑتا ہے اور ہوا بھی یہ ہے کہ سپیشل ایجوکیشن کے ارباب بست و کشاد عام طور پر وہ اشخاص رہے ہیں جن کا خصوصی تعلیم سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔ عام طور پر کسی ایک شعبے سے تبدیل کرکے کسی افسر کو خصوصی تعلیم کا شعبہ تھما دیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے پاس تعلیم یافتہ اور اہل معذورین نہیں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ تعلیم یافتہ معذورین کو صلاحیتوں کی بنیاد پر مشاورتی سطح پر شامل کیا جائے تاکہ ان کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ عام طور پر پاکستان ایسوسی

ایشن آف دی بلائنڈ کے کسی ایک نمائندے کو ایسے فورم میں مدعو کیا جاتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ہمیں سیاسی انداز سے نہیں بلکہ مخلصانہ طور پر یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کون سا شخص کس کام کے لئے کس قدر مفید ہے۔ اگر حکومت معذورین کی سچ مچ مدد کرنا چاہتی ہے' ان کے مسائل کو سمجھنا چاہتی اور عام الفاظ میں ان کی دعائیں حاصل کرنا چاہتی ہے تو حکومت کو ایسے افراد کی تلاش کرنی چاہئے جو خود معذوری کے تجربہ سے گذر رہے ہوں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں اور ایک آفاقی نظر رکھتے ہوں یہ تصور یکسر ختم کرنے کی ضرورت ہے کہ نابینا حضرات بالخصوص انتظامی امور سرانجام نہیں دے سکتے۔ مختلف اداروں میں بینا حضرات کی بجائے نابینا حضرات کو تعینات کیاجائے اور اسی طرح دیگر معذورین کو بھی ان کی صلاحیتوں کے مطابق مختلف ذمہ داریاں سونپی جانی چاہئیں۔ کس قدر تعجب خیز بات ہے کہ نابیناؤں کے لئے اداروں میں بینا پرنسپل موجود ہیں۔ جنہیں اس تجربہ سے گزرنے کا کبھی اتفاق بھی نہیں ہوا۔ ان میں سے بعض بریل انداز تحریر سیکھ لینے کا سرٹیفکیٹ حاصل کرکے اپنے آپ کو ان اداروں کا سربراہ ہونے کا اہل ثابت کرنے لگتے ہیں۔ ہمیں بینا حضرات سے کوئی مخالفت نہیں ایسا تصور بھی حیرت انگیز ہوگا کیونکہ ہمیں بینائی کی صلاحیتوں کا پورا احساس ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ حضرات اس انداز سے سوچ ہی نہیں سکتے جس انداز کی خصوصی تعلیم میں ضرورت ہوتی ہے اگر سچ مچ معذوری کے متعلق مسائل کا حل تلاش کرنا ہے تو معذورین سے متعلق ادارے اور حکومتی مشینری کو اہل اور تعلیم یافتہ معذورین کے حوالے کرنا ہوگا۔



نابینا افراد کی تعلیم و تربیت کا ایک حیرت انگیز اور تکلیف دہ پہلو

دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کے اس دور میں کون ہے جو زیور علم و ہنر سے آراستہ و پیراستہ نہیں ہونا چاہتا کون ہے جسے علم و ہنر کی اہمیت و افادیت کا احساس نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ حکومت کے پاس اتنے ذرائع نہ ہوں کہ وہ پرائمری تعلیم کو لازمی قرار دے سکے۔ یہ الگ بات ہے کہ پرئمری سکولز اتنے دور ہوں کہ دیہاتی بچے وہاں تک پہنچ نہ پائیں لیکن اس امر میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ آج کے دور میں کم وبیش ہر شخص تعلیم کی افادیت سے واقف ہے۔ اس کی بعض دیگر اغراض اسے اس امر پر مائل کر سکتی ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو اپنی مدد کے لئے استعمال کرنے لگے لیکن اسے بھی معلوم ہے کہ تعلیم کتنی اہم ہے یہی وجہ ہے کہ روزانہ سکول اور کالج کھولنے کی درخواستیں دی جاتی ہیں۔ اس کے لئے ہنگامے ہوتے ہیں اور سیاسی اثر و رسوخ استعمال ہوتا ہے۔ شہروں میں جہاں سرکاری سکول نہیں وہاں پرائیویٹ اداروں کا ایک جال سا بچھ گیا ہے۔ ماں باپ بھاری فیسیں ادا کر کے بھی اپنے بچوں کو اچھے سکولوں میں بھیجنا چاہتے ہیں۔ سرگودھا میں بعض سکول ایسے ہیں جہاں ماہانہ فیس ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ روپے تک ہے اور ایسے اداروں میں داخلہ لینے والے بچوں کے والدین کی بھیڑ

لگی ہوئی ہے' والدین سفارشیں تلاش کرتے ہیں' درخواستیں گزارتے ہیں۔

یہ سب کچھ عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ جس دور میں ہم سانس لے رہے ہیں اس میں تعلیم کی اہمیت کو مانا جاچکا ہے لیکن نابیناؤں کے لئے قائم کردہ اداروں کی صورت حال بالکل مختلف ہے جہاں بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے اقامتی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں' خوردونوش کا اہتمام کیا جاتا ہے' بریل میں کتب تیار کی جاتی ہیں تو کبھی صوتی کتب تیار کی جاتی ہیں۔ جانے کیا کیا اقدام اٹھائے جاتے ہیں کہ نابینا افراد تعلیم حاصل کر سکیں' ہنر حاصل کر سکیں تاکہ وہ معاشرے پر بوجھ بننے کی بجائے اس کی ترقی و ارتقاء میں اپنا کردار ادا کر سکیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ یہاں والدین اپنے بچوں کو بھیجنا ہی نہیں چاہتے ان کا خیال ہوتا ہے کہ بچے کی بینائی تو ضائع ہو ہی گئی ہے کیا اسے گھر سے بھی نکال دیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ کیا ہم ایک معذور بچے کے کفیل بھی نہیں ہوسکتےایک تو فطرت نے اس سے زیادتی کی ہے اور پھر والدین بھی بے رحم اور ظالم ہوجائیں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ معاشرے کے دیگر افراد بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔

گزشتہ دنوں کی بات ہے ایک نابینا بچہ ہمارے سکول میں داخل ہوا۔ ایک دو روز کے بعد اس کا باپ آن پہنچا اور کہنے لگا "جناب ہم اسے یہاں رکھنا نہیں چاہتے ہماری زندگی دوبھر ہوگئی ہے اہل محلّہ کہنے لگے ہیں کہ تم ایک بچے کا بوجھ بھی برداشت نہیں کرسکتے نظر کھو بیٹھا ہے تو اسے گھر سے نکال دیا ہے" اس شخص کی حالت دیدنی تھی وہ آبدیدہ ہو رہا تھا۔ اسے سمجھایا گیا کہ یہ رویہ درست نہیں آخر لوگ اپنے بینا بچوں کو بھی تو سکولوں میں بھیجتے ہیں بلکہ بہت دور بھیجتے ہیں تاکہ ان کا بچہ اچھے ادارے میں تعلیم پاکر زندگی کی تمام سہولتیں سمیٹنے کے

قابل ہوسکے' نہ صرف یہ کہ فیس ادا کرتے ہیں بلکہ اس کے خوردونوش' رہائش اور ملبوسات پر جانے کتنی رقم خرچ کرتے ہیں لیکن وہ شخص بات بالکل نہیں سمجھ سکا اور ہمیں بچے کو اس کے ساتھ بھیجنا پڑا۔ ہمارے ادارے میں ایک اور بچہ موجود ہے جو میٹرک کی تیاری کررہا ہے اس کے والدین کا خیال تھا کہ اسے نابینا سکولوں میں اپنی زندگی ضائع نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس سے تعلیم حاصل نہیں ہوگی۔ اسے چاہیے کہ وہ ان کے کپڑے کے کاروبار میں جس حد تک ان کی مدد کرسکتا ہے کرے کیونکہ اسے کچھ نظر بھی آتا ہے۔ لیکن بچے نے یہ دلیل قبول نہیں کی اور یہ ثابت کرنے پر مصر ہے کہ وہ یقیناً اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکتا ہے۔ نابینا بچوں کے والدین کو قائل کرنے کے لئے بڑے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ انہیں بار بار سمجھانا پڑتا ہے کہ "میاں صاحب' بھائی صاحب' محترم ایسا مت کیجئے' بچے کو ہمارے ادارے میں بھیجئے" اور کوئی صاحب یہ کہہ اٹھتا ہے "بچہ میرا ہے میں اس کے بارے میں بہتر فیصلہ کرسکتا ہوں" اور بعض اشخاص کا تو یہ خیال ہونے لگتا ہے ہم کسی اپنی غرض کے لئے اس کے بچے کو استعمال کررہے ہیں اور یہ کہ اگر وہ بچے کو اس ادارے میں داخل کرائے گا تو ہمیں اس کا ممنون احسان ہونا پڑے گا' کتنی عجیب کیفیت ہے' کتنا بڑا فرق!بینا بچے کے لئے تعلیم زندگی و موت کا سوال اور نابینا بچے کے لئے تعلیم ایک بیکار کوشش۔ بعض والدین کا خیال ہے کہ ان کا بچہ بینائی سے محروم ہوگیا ہے تو اس میں خدا کی کوئی مصلحت ہے اور مصلحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے ان کی مغفرت کے اسباب مہیا کرے گا چنانچہ وہ اسے کسی مدرسے میں داخل کروادینا چاہتے ہیں تاکہ قرآن پڑھے اور پڑھائے اور پھر اس وجہ سے ان کی مغفرت

ممکن ہو۔ اس سے کس نے انکار کیا ہے کہ قرآن پڑھنا اور پڑھانا ایک بہت بڑی نعمت ہے ایک بہت بڑی فضیلت لیکن اس لئے بینا اور نابینا میں کوئی تخصیص نہیں۔ قرآن مجید پوری امت مسلمہ کے لئے نجات اور رستگاری کا باعث ہے لیکن قرآن کو ان محدود معنوں میں جانچنا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

سرگودہا ڈویژن میں کوئی بیس ہزار ایسے افراد موجود ہیں جنہیں علم و ہنر کی دولت سے مالا مال کرکے ایک بھرپور زندگی گزارنے کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک بہت بڑی تعداد تو کشکولِ گدائی کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جس کی وجہ سے معاشرے کے غلط رجحانات ہیں کہ وہ اس طرح اپنی نجات کا راستہ تلاش کرتے ہیں اور بہت بڑی تعداد اپنے گھروں میں اپنے والدین اور رشتہ داروں کی دست نگر ہو کر زندگی کے دن کاٹ دیتی ہے اور نابیناؤں کے لئے قائم کردہ اداروں کا رخ نہیں کرتے۔ جو بچے نابینا سکولوں میں زیر تعلیم ہوتے ہیں ان میں اکثر و بیشتر کے والدین کبھی ان کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ ان کے مسائل سے روشناس نہیں ہوتے کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ان کے بچے کبھی ان کے لئے مفید ثابت نہیں ہوسکتے۔ تگ و تاز حیات میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتے لیکن اکا دکا مثالیں ملنے لگی ہیں جہاں والدین اپنے بچوں کی تعلیم میں دلچسپی لیتے ہیں مثلاً" دو نابینا بچوں کی ماں نے خود بریل سیکھی تاکہ وہ گھر میں اپنے بچوں کی رہنمائی کرسکے۔ اس طرح ایک بچے کی ماں پریشان حال ہمارے دفتر میں آئی کہ اس کا بچہ ایک انگلش میڈیم سکول میں پڑھتے پڑھتے نظر کھوتا جا رہا ہے

اور اس کو ڈاکٹر نے پڑھنے سے منع کردیا ہے کیا آپ اس کی مدد کرسکتے ہیں۔ اسے بھرپور تعاون کا یقین دلایا گیا اور اب وہ بچہ بریل سیکھ کر دوبارہ بینا بچوں کے ساتھ ایک عام سکول میں تعلیم پانے لگا ہے۔ تاہم ایسی مثالیں بہت کم ہیں یہی وجہ ہے کہ نابینا بچوں کو سکول میں لانا خاصا مشکل ہے۔ ان کے لئے ذرائع مہیا کرنے سے بھی کہیں زیادہ مشکل۔ ان بچوں کی تعلیم و تربیت اور رہائش کا تو انتظام کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے والدین کو قائل کرنا خاصا مشکل ہے۔ بعض ایسے بچے بھی ہوتے ہیں جنہیں داخل کر لیا جاتا ہے لیکن وہ دن رات کچھ اس طرح چیخ و پکار کرتے ہیں کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اور جب والدین یہ کیفیت دیکھتے ہیں تو انہیں واپس لے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا نہ رونا ان کے رونے سے بہتر ہے مگر انہیں معلوم نہیں کہ ان کا نہ رونا انہیں تمام زندگی کا رونا دے جاتا ہے ان کا مستقبل تاریک ہوجاتا ہے ان کی ازدواجی زندگی کا کبھی اہتمام بھی نہیں ہو پاتا اور اس طرح ایک فرد نہیں بلکہ ایک نسل ختم ہوجاتی ہے' ایک غلط رویے کا شکار ہوجاتی ہے ایک جہالت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔



نابینائی۔ ایک نفسیاتی تجزیہ

اس میں کلام نہیں کہ نابینا حضرات مفروضوں' خود ساختہ نظریات اور بے بنیاد تصورات کی دنیا میں سانس لے رہے ہیں اور کبھی کبھی ان پر عرصہ حیات اس قدر تنگ ہونے لگتا ہے کہ وہ جاں کنی کے تجربے سے گزرنے لگتے ہیں۔ بے بنیاد روایتی انداز فکر کی ان فضاؤں میں ان کے لئے سانس لینا دوبھر ہوجاتا ہے اور انہیں یوں لگنے لگتا ہے کہ جیسے وہ اس زمین و آسمان کی چکی میں پسنے کے لئے تخلیق ہوئے ہوں' ان کا یہ جذباتی طرز قابل تفہیم بھی ہے اور قابل توجہ بھی۔

جہاں نابیناؤں سے متعلق مختلف تصورات اور توہمات قائم کر لئے گئے ہیں وہاں ان کی کردار کشی کی کوششیں بھی ان کے لئے دلخراش تجربہ ہیں۔ عوام الناس میں نابیناؤں کے کردار سے متعلق مختلف آراء موجود ہیں اگر انہیں Dognas کہہ لیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے بارے میں اکثرو بیشتر یہ باور کر لیا جاتا ہے کہ وہ معاشرتی آداب سے مطلقاً بے بہرہ ہوتے ہیں ان کے سماجی رویے غیر صحت مندانہ ہوتے ہیں' یہ کہ وہ پرلے درجے کے تنگ نظر' زود رنج' بدلحاظ' ضدی اور دل کے کٹھور ہوتے ہیں دراصل یہ مفروضے قائم کرتے وقت بعض نفسیاتی حقائق کو نظرانداز کردیا جاتا ہے

اور پھر ہماری قوم کونسی اتنی تعلیم یافتہ ہے کہ انہیں سرے سے معلوم بھی ہو کہ انسانی شخصیت کے نفسیاتی عناصر بھی ہوتے ہیں۔ یہ کہ کردار سازی میں سماجی اور معاشرتی رویوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہ تصورات جو نابیناؤں سے مختص کر دیئے گئے ہیں دراصل معاشرے کے کسی بھی طبقے میں پیدا ہوسکتے ہیں۔ اس سے بینائی اور نابینائی کا کوئی تعلق نہیں جس ماحول اور سماجی پس منظر میں بے بصر حضرات زندگی کے دن کاٹتے ہیں اس میں اس قسم کے خدو خال کا تشکیل پا جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں چنانچہ نابیناؤں سے متعلق تصورات قائم کرنے سے پہلے چند نفسیاتی پہلوؤں پر نظر ڈال لینی چاہئے' یہ صحیح ہے کہ نابینا حضرات متذکرہ بالا ذہنی عوارض کا شکار ہوسکتے اور ہو بھی جاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ نابیناؤں کی ایک بہت بڑی تعداد سخت گیر رویے اختیار کئے ہوتی ہے ان کی وسیع نظری' فراخ دلی اور رواداری کے سرچشمے بڑی حد تک خشک ہوجاتے ہیں۔ اس طرح وہ انتہائی حساس ہوجاتے ہیں اور اکثر و بیشتر حالات میں تذبذب کا شکار ہوجاتے ہیں انہیں دوسروں پر شک ہونے لگتا ہے اور وہ تاریک پہلوؤں پر اپنی نظر زیادہ مرکوز کرنے لگتے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ان رویوں کے پس منظر میں بعض نفسیاتی عوامل کار فرما ہوتے ہیں جو بینا اور نابینا میں تخصیص نہیں کرتے' یہ عناصر اور عوامل بھلے چنگے انسانوں کو Depression یعنی افسردگی کا شکار بنا دیتے ہیں۔ یہ افسردگی دراصل مایوسی کا نتیجہ ہوتی ہے اس سلسلے میں ایک امریکی ماہر نفسیات Williard Gaylin لکھتا ہے۔

"We live in a time of self doubt unhappy about the world and unsure about our capacities to change it. We lose faith not only in our institutions but in ourselves."

فاضل ماہر نفسیات کا یہ تجزیہ بے بصر حضرات سے متعلق نہیں بلکہ پورے معاشرے سے متعلق ہے جن میں بینا حضرات اسی طرح شامل ہیں جس طرح کہ نابینا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب کوئی فرد بے چارگی کا شکار ہوجائے یا یہ محسوس کرنے لگے کہ اسے کوئی محبت کرنے والا نہیں' کوئی چاہنے والا نہیں۔ وہ تو ایک حرف مکرر کی صورت ہے جسے مٹا دینا چاہئے ایسی صورت میں نتائج بھیانک ہوجاتے ہیں۔

Sigmund Freud کے افکار سے بہت سے تعلیم یافتہ افراد واقف ہیں جس نے ذہنی عوارض کی وجوہ ناآسودہ جنسی رجحانات میں تلاش کی ہے وہ سمجھتا ہے کہ معاشرتی دباؤ کے باعث بعض جنسی خواہشات دب کر رہ جاتی ہیں لیکن لاشعور میں وہ ایک طوفان بپا کر دیتی ہیں اور اس طرح افعال و کردار کو بری طرح متاثر کرتی ہیں اس کا یہ قول انتہائی فکر انگیز ہے کہ

" Nothing ever experienced is ever absolutely forgotten."

اس کے خیال میں بچپن کے تجربات اساسی کردار ادا کرتے ہیں اگر بچپن کے دبے ہوئے جنسی رجحانات کو کوئی مثبت راہ نظر نہ آئے تو شخصیت درہم برہم ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہمیں یہاں فرائڈ کے اس نظریئے کی زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں لیکن یہ امر انتہائی اہم ہے کہ نابینا حضرات بینا حضرات کے مقابلے میں اس صورت حال سے کہیں زیادہ دوچار ہوجاتے ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر ماں باپ کی محبت سے محروم ہوتے ہیں بعد میں بھی انہیں کوئی نعم البدل میسر نہیں آتا۔ جنہیں ماں باپ کی محبتیں بھی میسر نہیں ہوتیں ان کے ساتھ کسی اور کو محبت کرنے کا خیال یا ضرورت کیونکر محسوس ہوسکتی ہے اکثر و بیشتر بے بصر افراد محبت کے دو بول کے لئے کاسہ تمنا اٹھائے پھرتے ہیں لیکن وہ خالی ہی رہتا ہے وہ ازدواجی زندگی کے مقصود تک سے محروم رہتے ہیں اس صورت حال میں ان کا ذہنی عوارض کا شکار ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔

ذہنی عوارض کی ایک اور اہم وجہ Alfred Adler نے بیان کی ہے جو Id، Ego اور Super Ego کے تصور کو تو زیادہ اہمیت نہیں دیتا اس کے خیال میں بنیادی وجہ Neurosis یا ذہنی عارضے کی بنیادی وجہ احساس کمتری کا تصور ہے۔ یہ احساس کمتری سماجی تفاوت سے پیدا ہوتا ہے اس کے خیال میں ہر فرد معاشرے میں ایک مقام پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں دوسروں سے بازی لے جانے کا جذبہ موجود ہوتا ہے اگر کوئی شخص اپنے آپ میں کوئی کمی محسوس کرے تو وہ اس کو دیگر ذرائع سے پورا کرلینا چاہتا ہے اگر یہ کوششیں صحیح سمت میں ہوں تو ایسا فرد احساس کمتری کا شکار

نہیں ہوتا لیکن اگر تلافی کی یہ صورت غلط راہیں اختیار کرے تو غیر صحت مند ذہنی رویہ جنم لیتا ہے۔

فرائڈ اور ایڈلر کے تصورات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی شخص بنیادی طور پر ذہنی عوارض کا شکار نہیں ہوتا اللہ تعالٰی نے اسے سوچنے کے لئے ذہن رسا عطا کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنی جسمانی کمزوریوں پر بھی قابو پا لیتا ہے لیکن یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ ایسا انفرادی طور پر ممکن نہیں معاشرتی رویے انسانی شخصیت کے خدوخال واضح کرنے میں اساسی کردار ادا کرتے ہیں۔ اور یہ امر بھی انتہائی اہم ہے کہ اس صورت حال میں نابینائی کی کوئی تخصیص نہیں۔ اگر ایک نابینا بچہ محبت اور ہمدردی کے ماحول میں پروان چڑھے ماں باپ کی محبت اور شفقت اسے حاصل ہو اس کی ذہنی اور جسمانی تربیت کا خاطر خواہ اہتمام ہو اسے زیور تعلیم سے آراستہ ہونے کے اتنے ہی مواقع میسر ہوں جتنے کہ بینا حضرات کو ہوتے ہیں اور پھر عملی زندگی میں اسے غیر معمولی مشکلات سے دو چار نہ ہونا پڑے وہ ایک معمول کی ازدواجی زندگی سے بہرہ مند ہو اور اسے شہری کی حیثیت سے وہی حقوق حاصل ہوں جو بینا حضرات کو ہوتے ہیں تو پھر میں اپنے تجربات کی روشنی میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک نابینا شخص ان تمام منفی رویوں سے مبراء ہو گا جن کا ذکر آغاز میں کیا گیا ہے۔ نہ وہ ضدی ہو گا نہ تنگ نظر' نہ وہ دوسروں کو شک کی نظر سے دیکھے گا اور نہ ہی اپنی رائے کو حتمی تصور کرے گا۔ لیکن بدقسمتی سے ایک نابینا فرد سماجی رویوں کا شکار

ہو جاتا ہے وہ سماجی رویے جو اسے عضو معطل گردان لیتے ہیں اور ترس اور رحم کے تیروں سے گھائل کردیتے ہیں اسے کہیں کا نہیں چھوڑتے اس صورت میں یا تو نابینا شخص مکمل طور پر اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں کھو بیٹھتا ہے کشکول گدائی ہاتھ میں تھام لیتا ہے اور اس کو اپنا مقدر جان کر قبول کر لیتا ہے یا پھر رد عمل کے طور پر منفی طرز عمل کا شکار ہو جاتا ہے چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ نابینا حضرات کو ذہنی خود کشی سے بچانے کیلئے ان کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا سلوک کیا جائے اور انہیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر اپنی زندگی کا اسلوب تراش سکیں اس طرح ہم ایک بہت بڑی قومی خدمت سرانجام دے رہے ہوں گے وہ قوم جو اپنے معذور افراد کی درست انداز سے مدد و اعانت نہیں کرتی وہ خود معذور ہو جاتی ہے اور انسانوں کی برادری میں باعزت مقام حاصل نہیں کر پاتی وہ اخلاقی دیوالیہ پن کی جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ معذور افراد بسا اوقات منفی رویوں کا شکار ضرور ہو جاتے ہیں لیکن اس کی ذمہ داری اس معاشرے پر ہوتی ہے جس میں وہ سانس لے رہے ہوتے ہیں۔ وہ معذور جو زیور علم و ہنر سے آراستہ ہو جاتے ہیں اور جن کی جھولی میں زندگی خوشیاں ڈال دیتی ہے وہ ایک بھرپور اور توانا زندگی گزارتے ہین ان کی مثالیں معاشرے کے لئے تحریک کا باعث بنتی ہیں اور جہد حیات میں ممدومعاون ثابت ہوتی ہیں۔



"وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ"

اسلام، جس نے تکریم انسانیت کا پرچم ہمیشہ بلند کئے رکھا اور انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے اور یہ تصور بھی پیش کیا ہے کہ انسانی عظمت کے سامنے جبیں سائی سے انکار نے شیطان کو شیطان بنا دیا' اسلام نے کہیں بھی مرد و زن میں تخصیص کو روا نہیں رکھا اسلام نے خواتین کیلئے مسرتوں اور کامیابیوں کے تمام دروا کر دیئے لیکن شومئی قسمت مرد زدہ معاشرے نے خواتین کو ہمیشہ ان کے انسانی حقوق سے محروم کرنے کے نت نئے حیلے بہانے تراشے۔

نابینا خواتین پر ظلم و ستم کی داستان کس قدر درد ناک ہو سکتی ہے اس کا اندازہ بیشتر معاشروں میں خواتین کی زبوں حالی اور کسمپرسی سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایسے معاشرے بھی موجود ہیں جنہوں نے خواتین کو محض شو پیس کے طور پر استعمال کیا اور محض انہیں اپنی ہوس کی تسکین بنایا۔ اگر مختلف دانش وروں کے اقوال کو ملحوظ نظر رکھا جائے تو صورت حال زیادہ واضح ہو کر سامنے آسکتی ہے۔

Susan B.Anthony کے خیال میں

"The only question left to be settled
now is a women Persons?"

Admund Burk نے کہہ دیا۔

"A women is but an animal and animal not of the highest order"

حد تو یہ ہے کہ یونان کے عظیم دانشور ارسطو نے خواتین کے بارے میں یوں کہا۔

"Woman may be said to be an inferior man"

ان مغربی دانشوروں کی آراء سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک خواتین کی کیا قدر و منزلت ہے۔ ان میں سے کوئی انہیں خدا کی دوسری غلطی قرار دیتا ہے تو کوئی انہیں سراپا کمزوری سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ مغرب نے انہیں عزت و تکریم کی انتہائی بلندیوں پر پہنچایا ہے۔ خود مشرق نے اپنی تمام تر روحانیت اور انسانیت کے باوجود انہیں ان کے بنیادی حقوق سے ہمیشہ محروم رکھنے کی کوشش کی۔ یہ تو کہہ دیا گیا کہ وجود زن ہی سے تصویر کائنات میں رنگ ابھرتے ہیں لیکن انہیں بہت کم ایسے مواقع فراہم کئے گئے کہ وہ ایک پر اعتماد زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں۔ ان کی تعریف و توصیف میں فارسی اور اردو شعراء کے دیوان تو بھرے پڑے ہیں لیکن عملی زندگی میں ان پر عرصہ حیات تنگ کیا جاتا رہا ہے اقبال نے ایک جگہ کہا تھا۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

دراصل یہ فرائڈ زدہ اذہان عورت کو محض اپنی جنسی خواہشات کے خوابوں کی تعبیر سمجھ کر ان سے اٹکھیلیاں کرتے رہے۔ کبھی انہیں طوائف کی شکل میں دیکھا تو کبھی شمع محفل کی صورت میں لیکن انہیں کبھی ایک معزز اور مہذب شہری کے حقوق تفویض نہیں ہونے دیئے۔

مغرب ہو کہ مشرق خواتین ہمیشہ روح فرسا اور زہرہ گداز مسائل سے دو چار رہی ہیں کسی نے "Tess" کی صورت میں چیخ چیخ کر اپنی زندگی بتا دی تو کوئی Maggi کی طرح زندگی کے سیلاب بلاخیز کے سپرد ہو گئی کہیں کسی Othello نے کسی Desdemona کا گلا دبا دیا تو کہیں کسی اکبر نے کسی انار کلی کو دیوار میں چنوا دیا ایسے ماحول میں نابینا خواتین کی حالت زار کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں۔ جہاں نابینا مردوں کو تیسرے اور چوتھے درجے کا شہری تصور کیاجاتا ہے وہاں نابینا خواتین کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے اس کے تصور ہی سے رو نگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ ترقی پذیر معاشروں میں جن میں پاکستانی معاشرہ بھی شامل ہے نابینا خواتین ساغر صدیقی کے الفاظ میں یہ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

حقیقت یہ ہے کہ نابینامرد پھر بھی کسی نہ کسی طرح اپنا پیٹ بھر سکتے ہیں مگر نابینا خواتین اپنی زندگی کے دن رات کیسے کاٹتی ہو نگی یہ ایک اہم سوال ہے۔ نابینائی کی بدترین صورت گداگری ہے لیکن نابینا گداگروں کے کشکول کھنکتے سکوں سے بھرے ہوتے ہیں اگر وہ اس قعرمذلت سے نکل آئیں تو کم از کم کسی مسجد

میں ہی پناہ تلاش کر سکتے ہیں بہت سے نابیناؤں کو بسوں اور گاڑیوں میں اشیاء بیچ کر کسب معاش کرتے ہوئے ہر وقت دیکھا جاسکتا ہے لیکن بے بصر خواتین زندگی کا کونسا اسلوب تراشتی ہو نگی اس کا خیال بہت کم ذہنوں میں آتا ہو گا۔ یہ درست ہے کہ اب نابینا لڑکوں کی طرح نابینا لڑکیاں بھی زیور علم و ہنر سے آراستہ ہونے لگی ہیں۔ ان میں کچھ سکولوں میں کالجوں میں تدریسی فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ اور بعض ٹیلی فون آپریٹر کے طور پر کام کر رہی ہیں جن میں سے ایک جواں ہمت خاتون فاخرہ تبسم حزیں بھی ہیں اسی طرح سماجی کارکن کے طور پر نابینا خواتین کی خدمات قابل رشک ہیں۔ اس سلسلے میں پاکستان کی دو خواتین ہمارے لئے روشنی کا مینار ہیں۔ ایک ڈاکٹر فاطمہ شاہ ہیں' جنہوں نے ایک بینا خاتون کی حیثیت سے اپنی ہمت و عظمت کے جھنڈے گاڑے اور پھر بینائی سے محروم ہو کر بھی انہوں نے پاکستان کے نابیناؤں کی زندگیوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ پاکستان میں پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ کی داغ بیل ڈالی اور انٹرنیشنل فیڈریشن آف دی بلائنڈ کی صدر بھی رہیں اسی طرح ڈاکٹر سلمیٰ مقبول نے بینائی سے محروم ہو جانے کے بعد بھی گراں بہا خدمات سرانجام دی ہیں اور مختلف حیثیتوں سے ان کا کام قابل صد تحسین ہے ان خواتین نے نہ صرف اپنی زندگیوں میں ایک انقلاب برپا کیا بلکہ ملک بھر کے نابیناؤں کی زندگیوں میں بھی بجلیاں بھر دیں۔ لیکن یہ اکا دکا مثالیں تسکین کا باعث نہیں ہو سکتیں یہ تو استثنائی صورتیں ہیں مجموعی طور پر پاکستان میں نابینا خواتین کی حالت انتہائی تشویش ناک ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ نابیناؤں میں پچاس فی صد خواتین ہیں اور

زیادہ تر دیہات میں اپنی زندگی کے شب و روز بتا رہی ہیں۔ وہ تعلیم کی نعمتوں سے فیض یاب ہونے کے ہر ذریعے سے محروم ہیں ان کا نہ کوئی گھر میں مقام ہے نہ معاشرے میں وہ تو محض درد و غم بے بسی اور مجبوری کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں جنکی حالت زار پر شاید کسی کی آنکھ بھی نم نہ ہوتی ہو جنہیں اکثر و بیشتر والدین کسی گناہ کی سزا تصور کرتے ہیں اور کسی سے ان کا ذکر بھی توہین گردانتے ہیں انہیں صبر و شکر سے زندگی گزارنا ہوتی ہے اور یوں ہی ان کی زندگی کا سورج ہمیشہ کیلئے غروب ہو جاتا ہے۔ بعض دینی تعلیم حاصل کر لیتی ہیں اور کچھ بچوں کو پڑھا دیتی ہیں بعض اعزہ اور اقارب کے ٹکڑوں پر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہیں ازدواجی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتیں بلکہ بعض حالات میں ان کی وجہ سے ان کی باقی بہنوں کی ازدواجی زندگی بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے اس طرح وہ رحم و کرم کی بھیک سمیٹتی رہتی ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ ان کی حالت زار کو سنوارنے کی مقدور بھر کوشش کی جائے۔ انہیں زندگی کے تمام دھارے میں شامل کیا جانا چاہئے اور اس کے لئے سماجی کارکنوں کو گھر گھر جاکر انکی تعلیم و تربیت کرنی چاہئے انہیں بریل سکھائی جانی چاہئے اور امور خانہ داری سے واقف کرانا چاہئے۔ انہیں سینے پرونے' گھر داری' بچوں کی نگہداشت کپڑے دھونے اور گھر سنوارنے کی تربیت دی جانی چاہئے اور گھریلو دستکاریاں سکھائی جانی چاہئیں۔ انہیں مرغ بانی' زراعت اور باغبانی کی تربیت بھی دی جا سکتی ہے۔ جہاں جہاں ایسے تجربے کئے گئے ہیں وہاں نتائج انتہائی حوصلہ افزاء رہے ہیں۔

تعلیم یافتہ نابینا خواتین کو ٹائپنگ سکھائی جانی چاہئے اور موبلٹی ٹریننگ دی جانی چاہئے تاکہ وہ معاشرے میں گھل مل سکیں لیکن اس سے کہیں زیادہ ضروری

یہ ہے کہ خواتین سے متعلق ضروری اعداد و شمار اکٹھے کئے جائیں تاکہ ان کے بارے میں ہمہ جہتی کوششوں کو منظم کیا جاسکے۔ اس کے بعد ہی ممکن ہو گا کہ ہمیں مسئلے کی صحیح نوعیت کا علم ہو سکے اور ان اعداد و شمار کی روشنی میں نابینا خواتین کیلئے ادارے قائم کئے جاسکتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کو یقینی بنایا جاسکتا ہے اور ان کے حالات کار کو بہتر بنانے کی کوششیں تیز تر کی جاسکتی ہیں۔ ملک بھر کے نابینا افراد کے لئے پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ سرگودہا اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ وقت آگیا ہے کہ نابینا خواتین ایک ملک گیر تحریک شروع کریں اورایک اپنی تنظیم قائم کریں اگر فی الحال ایسا ممکن نہیں تو پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ کے فورم پر ہی ایک ذیلی قومی ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے نابینا خواتین کے حوالے سے یہ بات اور بھی اہم ہے کہ انہیں مخلوط تعلیم کے منفی اثرات سے محفوظ رکھا جائے اور ان کے لئے الگ ادارے قائم کئے جائیں۔ یہ اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ رضا کار تنظیمیں اسے حاصل کرنے کی کوشش بھی کریں تو خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں کر سکتیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس اہم مسئلے کی طرف فوری توجہ دے یہ اسلامی روح کے عین مطابق بھی ہے اور اس کا بھر پور تقاضا بھی' اگر ہمیں یقین ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور قوم کے دکھی طبقے کے مسائل حل کرنا اسلام کی پہلی شرط ہے تو ہمیں اپنی مجرمانہ غفلت پر نادم ہونا چاہئے اور ہزاروں سسکتی ہوئی زندگیوں کو زندہ درگور ہونے سے بچانے کی کوئی سبیل نکالنی چاہئے۔



پندرہ اکتوبر، نابیناؤں کا عالمی دن بحوالہ سفید چھڑی

زندگی جانے کب سے سفر میں ہے کبھی چلچلاتی دھوپ سفر کو ہمت آزما بنا دیتی ہے تو کبھی کوئی شجر سایہ دار ہمت بندھاتا ہے۔ سفر جاری ہے اور جانے کب تک جاری رہے گا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا ہے کہ رفتار تیز ہو گئی ہے حالانکہ دنیا سمٹ کر ایک خاندان میں تبدیل ہو چکی ہے لیکن یہ خاندان بھی تو ساڑھے پانچ ارب افراد پر مشتمل ہے اس خاندان نے باہمی میل جول کیلئے تیز ترین ذرائع رسل و رسائل وضع کر لئے ہیں لیکن پھر بھی پاؤں کی اہمیت کم نہیں ہوئی جب تک پاؤں زمین پر نہ ہوں زندگی کا سفر جاری ہی نہیں رہ سکتا چنانچہ انسان اپنی تمام تر مساعی کے باوجود اپنے پاؤں کے استعمال پر مجبور ہے لیکن نابینا افراد اپنے پاؤں کا استعمال تو کر سکتے ہیں لیکن ابھی سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی کہ پاؤں سے آنکھوں کا کام لیا جاسکے لیکن اس کے باوجود انہیں بھی چلنا ہے وہ اس خاندان کا ایک جزولاینفک ہیں۔ انہیں بھی اپنے معاش کے لئے حصول علم کیلئے اور باہمی تعلقات کو برقرار رکھنے کیلئے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ انہیں ہمہ وقت کوئی بینا ہمسفر میسر آسکے اور اگر آ بھی جائے تب بھی یہ آزادی کوئی مکمل آزادی تو نہ ہوئی کبھی انسان تن تنہا بھی

زندگی کا سفر جاری رکھنا چاہتا ہے اور از خود اپنے کام کرنا چاہتا ہے۔

اس خواہش کی تکمیل کیلئے جانے کب سے چھڑی کا استعمال کیا جاتا رہا ہے جس کی مدد سے نابینا حضرات ایک جگہ سے دوسری جگہ تک سفر کرتے رہے ہیں اور اپنے سماجی' معاشرتی اور اقتصادی فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ لیکن وہ چھڑی جو نابیناؤں کی ہم سفر تھی اس کے لئے عزت و وقار کا باعث نہ تھی۔ وہ اس امر کی غماز تھی کہ چھڑی استعمال کرنے والا بے سہارا مجبور معذور اور قابل رحم ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بے بصر حضرات میں جہد حیات کی شمع کی لو تیز ہوئی زندگی نے نئی کروٹ لی ان میں یہ احساس بیدار ہوا کہ اگر بینائی چھن گئی ہے تو کیا غم اور بہت سی صلاحیتیں ہیں جنہیں بروئے کار لاکر زندگی کے سفر کو جاری و ساری رکھا جاسکتا ہے۔ یہ سوچ ایک طویل سفر کا نتیجہ تھی لیکن جب یہ بیدار ہوئی تھی تو اسلوب حیات ہی منقلب ہو گیا۔ بے بصر حضرات کو گویا بصارتیں مل گئیں بشارتیں مل گئیں اور گویا ان کی نئی زندگی کا ماہتاب عالم تاب طلوع ہو گیا' اندھیرے سمٹ گئے' اعتماد کی روشنی نے ان کی زندگی کو بقعۂ نور بنا دیا۔ ضروری تھا کہ وہ اپنے سفر کو جاری رکھیں نئے شعور کے ساتھ' نئی آگہی کے ساتھ نئی ذمہ داریوں اور نئی امنگوں کے ساتھ اور "سفید چھڑی" اس کا اشاریہ قرار پائی اس کی علامت بن گئی اور عالمی طور پر اسے تسلیم کر لیا گیا حقیقت یہ ہے کہ سفید چھڑی کے استعمال نے دنیا بھر کے بے بصر حضرت کو سیمابی قوت عطا کر دی ہے۔ شاہراہوں پر ان کا حق تسلیم کرا لیا ہے اور یہ امر روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے کہ سفید چھڑی کو تھامنے والا ہاتھ اپنی تقدیر خود رقم کر سکتا

ہے۔ اس کی مدد سے اٹھنے والے پاؤں اپنی منزل کو خود تلاش سکتے ہیں۔ اب وہ ترحم بے بسی کی سسکتی ہوئی' تڑپتی ہوئی تصویر نہیں بلکہ ایک معزز شہری ہے جسے وہی حقوق حاصل ہیں جو اس کے بینا ساتھی کو۔

یہ دن ۱۹۶۵ء سے عالمی پیمانے پر منایا جاتا ہے اور اس اجتماعی عہد کی تجدید کی جاتی ہے کہ معاشرے کے ہر فرد کو خواہ وہ بینا ہو یا نابینا زندگی کی بنیادی سہولتیں حاصل کرنے کا مساویانہ حق ہے یہ دن نابیناؤں کی اجتماعی مساعی کو منظر عام پر لانے کا دن بھی ہے یہ دن حکمرانوں کو ان کا یہ فرض بھی یاد دلاتا ہے کہ قوم و ملت کے بے بصر افراد کی تعلیم و تربیت' اقتصادی'سماجی اور معاشرتی بحالی اور ان کا آئینی اور قانونی فرض ہے یہ دن ملک کے مخیر حضرات کے در ضمیر پر ایک دستک بھی ہے ایک یاد دہانی ہے کہ وہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور مستحق افراد ملت کی کس طرح مدد و اعانت کرتے ہیں۔ سفید چھڑی امن کی علامت بھی ہے اور سفید چھڑی کبھی کبھی عصائے موسوی کی یاد دلاتی ہے اور اس جانب اشارہ کرتی ہے۔

عصانہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی فرد یا گروہ کا سماجی استحصال ہو رہا ہے ہو اسے زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم کیا جارہا ہو اسے تیسرے اور چوتھے شہری کا درجہ دیا جارہا ہو تو پھر سفید چھڑی عصائے موسوی بن کر حق و خیر کی راہیں متعین کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے لیکن بنیادی طور پر سفید چھڑی امن اور محبت کا پیام ہے صاحب ایمان اور صاحب دل حضرات کو

بھی واضح پیام ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور بے بصر حضرات کے دکھوں کو اپنا دکھ گردانیں اور اس ذات بے ہمتہ کیلئے سراپا سپاس ہو جائیں کہ جس نے انہیں بینائی کی نعمت سے نوازا ہے اور تشکر کے طور پر اپنی تمام تر صلاحیتیں دینا بھر کے لاکھوں بے بصر افراد کی مدد و اعانت کیلئے وقف کر دیں۔

مغربی ممالک میں سفید چھڑی کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور بہت سے ممالک میں قوانین بھی وضع کر دیئے گئے ہیں کہ جہاں کوئی نابینا شخص سفید چھڑی لئے شاہراہوں پر دکھائی دے اس کی مدد کی جائے اگر وہ سفید چھڑی کو لہرائے تو گاڑی روک دی جائے تاکہ وہ اس میں سوار ہو کر اپنی منزل تک پہنچ سکے لیکن ہمارے وطن عزیز میں ابھی سفید چھڑی کی اہمیت کا احساس پوری طرح بیدار نہیں کیا جاسکا۔ بہت سے شہروں اور قصبوں میں تو پولیس کے افراد اور عوام الناس کو اس کا علم تک نہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ شاہراہوں پر سفید چھڑی کے استعمال کو تحفظ دیا جائے اور ڈرائیوروں کے لائسنس میں ہدایات درج ہوں اور پولیس کے عملے کو بھی اس سے بخوبی آگہی ہو۔ ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ سفید چھڑی کے استعمال کی تربیت کیلئے ادارے قائم کئے جائیں تاکہ نابینا حضرات اس کا صحیح استعمال کر سکیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضروری ہے کہ سفید چھڑی ہر نابینا فرد کو مہیا ہو۔ سفید چھڑی کو مقبول کرانے کے لئے انجمن ہذا نے اپنے ماہانہ جریدے کا نام ہی سفید چھڑی رکھ دیا ہے اور اس کے ٹائیٹل میں سفید چھڑی کو شامل کر کے اپنا فرض سرانجام دیا ہے۔

یہ درست ہے کہ مغربی ممالک میں شاہراہوں پر چلنے کیلئے تربیت یافتہ کتوں کا استعمال بڑی کامیابی سے جاری ہے لیکن یہ ہمارے معاشرتی پس منظر میں مستحسن دکھائی نہیں دیتا۔ علاوہ ازیں یورپی ممالک میں (Laser cane) کا استعمال بھی کیا جارہا ہے۔ یہ ایک ایسی اختراع ہے جو چند لہروں کے ذریعے نابینا کو آگے کی رکاوٹوں سے آگاہ کر سکتی ہے لیکن اس کا استعمال ابھی عام نہیں ہوا۔ توقع کی جانی چاہئے کہ کوئی ایسی اختراع وضع کر لی جائے گی جس سے آمدورفت میں زیادہ سہولت مہیا ہوسکے۔ اس سہولت کے علاوہ جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے سفید چھڑی ایک علامت ہے نابیناؤں کے اتحاد کی' ان کے مسائل سے عوام الناس کو روشناس کرانے کی' بدقسمتی سے ابھی بہت سی ایسی رکاوٹیں موجود ہیں جن کے باعث پاکستان کے چھ لاکھ بے بصر حضرات اب بھی بنیادی انسانی ضروریات سے محروم ہیں بلکہ ابھی تو نابینا حضرات کے لئے جانے کتنے چیلنج باقی ہیں۔ جن سے انہیں ہمہ وقت نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کیلئے کہ وہ بھی جیتے جاگتے انسان ہیں ان کے سینے میں بھی ایک دل دھڑکتا ہے ان کا ذہن فکر و ادراک سے لبریز ہے اور انکی زندگی بھی انہی خوابوں سے عبارت ہے جو ایک جیتے جاگتے گوشت پوست کے انسان کے خواب ہوتے ہیں۔ پندرہ اکتوبر اسی جذبہ کو عام کرنے کی ایک کوشش ہے۔



"کلامِ اقبال" معذورین کے لیئے

وہ کہ جس نے دلوں کو "ولولۂ تازہ" عطا کیا "خاک راہ" کو راز الوندی بتایا' وہ کہ جس نے "ناقہ بے زمام" کو "سوئے قطار" کھینچا جس نے "کنجشک فرو مایہ" اور "کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر" پیدا کیا' یقیناً افسردہ پژ مردہ بے آس اور بے سہارا افراد کیلیے بڑی طمانینت اور حوصلے کا باعث ہونا چاہیۓ۔ معذورین جو کہ دنیا کی آبادی کا دس فیصد ہیں موت و زندگی کی کشمکش سے دو چار ہیں جن کی معذوری معاشرتی تصورات نے مجبوری میں تبدیل کر دی ہے اگر کوئی بینائی سے محروم ہے تو اس سے قوت سماعت' قوت لامسہ' قوت شامہ جیسی صلاحیتیں بھی چھین لی ہیں اگر کوئی سن نہیں سکتا تو معاشرتی رویوں کے باعث اس کی آنکھیں بھی بصارت سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی عضو کسی حادثے میں ضائع ہو گیا تو گویا جیتا جاگتا انسان ہی مفلوج و معذور ہو کر رہ گیا۔ معاشرہ ایسے افراد کی جھولیاں ترحم کی بھیک سے بھر کر اپنے دل کا اطمینان حاصل کرنے میں محو دکھائی دیتا ہے اور اس طرح معذور افراد سے جینے کا حوصلہ ہی چھین لیا جاتا ہے۔ انہیں یہ باور کرا دیا جاتا ہے کہ وہ کسی طور بھی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاسکتے ان پر یہ بات تو واضح کر دی جاتی ہے کہ ان کے یا ان کے

اجداد کے گناہ کے بدلے میں ان کی معذوری واقع ہوئی ہے اور اس طرح معذور افراد جیتے جی موت کی آغوش میں راحت تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اقبال، کہ جس کا کلام حوصلوں کی ایک ایسی قندیل ہے جسے وقت کی صر صر کبھی بجھا نہیں سکتی' اقبال کہ جس کا پیام' پیام زندگی اور زندہ دلی ہے' اقبال کہ جس کے اشعار ہر لمحہ حوصلے اور ہمتیں بانٹتے ہیں' آرزوئے حیات کی لو تیز کرتے ہیں اور ہر لحظہ "نیا طور" اور "برق تجلی" کی تمنا بیدار کرتے ہیں اقبال کہ جس کا فکر شب تار حیات میں ایک مینارہ نور ہے وہ اقبال یقیناً معذورین کیلئے ایک پیام زندگی رکھتا ہے۔ میں اپنی زندگی کے حوالے سے اس حقیقت سے کبھی صرف نظر نہیں کر سکتا کہ جب میری دنیا تاریک ہو گئی جب بظاہر مجھے کامیابی کے تمام راستے مسدود محسوس ہونے لگے جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں زندگی میں کچھ بھی نہیں کر پاؤں گا' جب میرے والدین ' اعزہ و اقرباء میری بدقسمتی پر نوحہ و ماتم کر کر کے تھک گئے تو مجھ میں ایک حوصلہ پیدا ہوا' ایک ہمت جاگی مجھے لاہور میں نابیناؤں کیلئے ادارے میں داخل کرا دیا گیا تو میرے استاد محترم نے کلام اقبال پڑھ پڑھ کر زندگی کے امکانات مجھ پر واضح کرنا شروع کئے اور مجھے اقبال کے بہت سے اشعار یاد ہو گئے ۔ یہ اشعار کیا تھے میرے لئے پیام زندگی تھے نوید حیات تھے اور مژدہ جانفزا تھے۔ اس وقت میں اقبال کا زیادہ کلام نہ پڑھ سکتا تھا' نہ سمجھ سکتا تھا بہرحال کچھ اشعار ایسے ضرور تھے جنہیں سمجھنا میرے بس

میں بھی تھا اور یوں کلام اقبال میں میری دلچسپی بڑھتی رہی۔

میرا خیال ہے کہ جہاں کلام اقبال نے ملت بیضا کو ایک سمت عطا کی ہے وہاں معذورین بھی اس سے فیض یاب ہو سکتے ہیں اور اپنی زندگی کو بامقصد بنا سکتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں' کان' زبان اور دیگر اعضاء خارجی اسباب ہیں۔ ہمتوں کا منبع انسان کی قوت ارادی ہوتی ہے اور اقبال نے اپنے کلام میں اسی قوت ارادی کو مضبوط اور مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی کو وہ خودی کا نام دیتے ہیں۔ خودی زندگی کی کسی بھی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتی اور آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

"خودی کیا ہے؟ راز درون حیات
خودی کیا ہے بیداری کائنات

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے' نہ حد سامنے

زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

ازل سے ہے یہ کش مکش میں اسیر
ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے"

"قطرہ چوں حرف خودی از بر کند
ہستی بے مایہ را گوہر کند
"خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
مقام رنگ و بو کا راز پا جا
بارنگ بحر ساحل آشنا رہ
کف ساحل سے دامن کھینچتا جا"
"خودی صیاد و نخچیرش مہ و مہر
اسیر بند تقدیرش مہ و مہر"
"خودی شیر مولا' جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید' آسماں اس کا صید"

کلام اقبال حوصلوں کا ایک بحر بیکراں ہے اور ہمتوں کی کائنات ہے۔

"سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالم، بشریت کی زد میں ہے گردوں"
"اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں"
"کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش"

کلام اقبال جسد مردہ میں ایک روح تازہ پھونکنے کی صلاحیت رکھتا ہے ان

کا کلام پڑھتے جایئے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ بدن میں تازہ لہر دوڑ رہی ہو' مشکلات دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہیں اقبال نے مرد مومن کے حوالے سے جو کچھ کہا ہے اس سے ان کے قارئین بخوبی واقف ہیں انہوں نے مرد مومن کو بے پناہ صلاحیتوں سے متصف قرار دیا ہے چنانچہ "بانگ درا" سے لے کر "ارمغان حجاز" تک وہ حوصلوں کے نت نئے آفتاب و مہتاب تراشتے دکھائی دیتے ہیں ان کے نزدیک کوئی چیز بھی ناممکن نہیں کہ انسان کی قوت ارادی کے سامنے پہاڑ بھی رائی بن جاتے ہیں چنانچہ ہمارے خیال میں کلام اقبال معذورین کے لئے بے پناہ اہمیت کا حامل ہے اور انہیں جینے کا وہ حوصلہ عطا کر سکتا ہے جس سے مایوسی کے تمام اندھیرے اجالوں میں تبدیل ہو سکتے ہیں اور منفی معاشرتی رویے بھی ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ جب اندر کا انسان بیدار ہو جاتا ہے ' جب عمل کی شمع جلنے لگتی ہے' جب آس کی صبح طلوع ہوتی ہے' تو پھر کوئی منفی قوت بھی سنگ راہ نہیں بن سکتی بلکہ ہمیں ترس کھانے والوں پر ترس آنے لگتا ہے اور ہم یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ لوگ جو ہمیں بیکار اور بے مصرف سمجھتے ہیں دراصل وہ انسانی عظمت سے واقف ہی نہیں ' انہیں معلوم ہی نہیں کہ انسان کتنی بڑی قوت ہے ---------- ناقابل تسخیر قوت ----

ملازمتوں میں ایک فیصد کوٹہ کے حوالے سے نابیناؤں کی مشکلات

اگر یہ کہا جائے کہ ہماری قوم کو رحمت کو زحمت میں بدلنے کا ہنر خوب آتا ہے تو چنداں غلط نہ ہوگا۔ ماضی قریب کے حالات کا سرسری سا جائزہ بھی اس حقیقت کی غمازی کرے گا کہ من حیث القوم ہمارا مزاج کچھ ایسا بن گیا ہے کہ ہم بہرطور آسانیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے اخلاقیات کے قواعد و ضوابط بھی توڑنے میں بسا اوقات کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔

ملازمتوں میں معذورین کے لئے ایک فی صد کوٹہ جانے کتنی مساعی کا رہین منت ہے یہ کوٹہ ایک آرڈیننس کے ذریعے ۱۹۸۱ء میں منظور کیا گیا اور اس سے کوئی پندرہ بیس سال پہلے یہ تصور بھی محال تھا کہ کوئی معذور آسانی سے ملازمت حاصل کرے گا۔ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں پاکستان بھر میں ایم اے تک تعلیم حاصل کرنے والا پہلا نابینا تھا مجھے یہ بہت کم یقین تھا کہ مجھے گورنمنٹ کی

تعلیم یافتہ ہو جائے تدریس کے فرائض سرانجام نہیں دے سکتا' اگلے سال پھر میں نے اس کالج میں ملازمت کے لئے درخواست گزاری۔ ابھی انٹرویو کا نتیجہ نہیں نکلا تھا کہ حکومت پنجاب نے مجھے میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کرنے سے مستثنیٰ قرار دے دیا اور پبلک سروس کمیشن نے انٹرویو کر کے مجھے بطور لیکچرر منتخب کر لیا اور پھر مجھے ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو گورنمنٹ کالج سرگودہا میں بطور لیکچرر تعینات کر دیا گیا۔

یہ تو ایک استثنائی صورت حال تھی اور پھر میری مثال کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے اور میری کارکردگی کے پیش نظر دیگر نابیناؤں کو بھی ملازمتیں ملنے لگیں لیکن یہ سب ذاتی کوششوں کے نتیجے میں ممکن ہو سکتا تھا چنانچہ نابیناؤں کے لئے تنظیموں نے اپنی کوششیں تیز تر کردیں اور حکومت پر زور ڈالا کہ معذورین کے لئے ملازمتوں میں کوٹہ مقرر ہونا چاہئے شاید یہ ممکن نہ ہوتا اگر اس وقت کے حکمران اعلیٰ جنرل ضیاء الحق کو اپنی معذور بیٹی کے دکھ کے باعث عام معذورین کے دکھ کا احساس نہ ہوتا چنانچہ ایک آرڈیننس کے ذریعے انتہائی نیک نیتی سے معذورین کے لئے ملازمتوں میں ایک فی صد کوٹہ مقرر کر دیا گیا اور یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اگر کوئی ادارہ کسی معذور کو ملازمت نہیں دیتا یا اسے کوئی اہل معذور دستیاب نہیں ہوتا تو اسے ایک مقررہ رقم معذورین کی فلاح کے لئے حکومت کے حوالے کرنا ہوگی جو معذروین کی فلاح و بہبود' تعلیم و تربیت اور بحالی پر استعمال ہوگی۔

بظاہر یہ ایک بہت بڑا قدم تھا ایک سنگ میل' معذورین خوش تھے کہ بالآخر وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اپنی زندگی گزار سکیں گے اور ایک فعال شہری

کی طرح اپنا کردار ادا کرسکیں گے اس سے قطع نظر کہ اس آرڈیننس پر ابھی تک صحیح طریقے سے عمل نہیں ہوا اور باوجوہ بہت کم معذورین کو ملازمتیں حاصل ہوسکی ہیں چند نکات انتہائی قابل غور ہیں جن کی وجہ سے آرڈیننس کی شکل ہی مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ ملازمتیں حاصل کرنے کے لئے معذورین کو ایک ـــــــ

Assessment Board

کے سامنے پیش ہونا ہوتا ہے جس میں محکمہ سماجی بہبود کا ایک افسر ایک ماہر نفسیات اور ایک میڈیکل سپرنٹنڈنٹ شامل ہوتے ہیں اور وہ اپنی صوابدید کے مطابق معذوری کا سرٹیفیکیٹ دیتے ہیں اور متعلقہ معذور کے لئے بعض ملازمتوں کی نشاندہی کردیتے ہیں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مذکورہ بورڈ میں معذرزین کا کوئی ماہر، تعلیم یافتہ اور تجربہ کار نمائندہ نہیں ہوگا تو یہ فیصلہ کرنا کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ اس شخص کے لئے کونسی ملازمت ممکن ہوگی۔ معذورین کا وہ نمائندہ جو خاصا ذاتی تجربہ رکھتا ہو اور مختلف معذورین کے مسائل سے واقف ہو۔ اس سلسلے میں صحیح رائے رکھنے کا مجاز ہوسکتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی بڑی حد تک ممکن نہیں کہ ایک میڈیکل آفیسر معذوری کا صحیح تعین کرسکے، بالخصوص اس شکل میں جبکہ کوئی شخص غلط طور پر معذوری کا سرٹیفیکیٹ حاصل کرنا چاہے اگر کوئی شخص یہ ثابت کرنا چاہے کہ اسے کم نظر آتا ہے یا کم سنائی دیتا ہے تو ڈاکٹر کے لئے اس کے برعکس فیصلہ کرنا خاصا مشکل ہے تاآنکہ وہ جدید سائنسی آلات استعمال نہ کرے اور خاصا محتاط نہ ہو جبکہ عام طور پر معائنہ کرتے وقت کسی طرح کی احتیاط کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ ہمارے ادارے کا ایک نابینا طالب علم جس نے میٹرک کرلیا تھا ایک Assessment Board کے

سامنے پیش ہوا۔ Assessment Board نے تحریر کیا کہ وہ دینی تعلیم حاصل کرسکتا ہے جب وہ طالب علم ایک ایلمنٹری کالج میں پی ٹی سی میں داخلہ لینے کے لئے گیا تو اسے Assessment Board کے سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر داخلہ نہیں ملا کیونکہ سرٹیفکیٹ پر تو اسے صرف مذہبی تعلیم حاصل کرنے کا اہل قرار دیا گیا تھا ہمارے خیال میں Assessment Board کو معذورین کے لئے ملازمتوں کا تعین کرنے سے گریز کرنا چاہئے جب تک کہ پہلے سے اس کے پاس ملک بھر میں معذورین کے لئے ملازمتوں کی لسٹ موجود نہ ہو جبکہ اس قسم کی لسٹ بھی موجودہ حالات میں نامکمل ہوگی کیونکہ معذورین جس قدر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں اسی قدر ان کے لئے امکانات وسیع تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

اس آرڈیننس سے متعلق ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ مختلف ادارے بعض ایسے معذورین کو ملازمت دے دیتے ہیں جنہیں معذورین کی فہرست میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً" کسی کو چلنے میں قدرے دشواری پیش آتی ہے کسی شخص کو کمر میں کوئی تکلیف ہے یا کسی کا ہاتھ صحیح طرح سے کام نہیں کرتا۔ اسی طرح کی کوئی معمولی سی جسمانی دقت' کیونکہ آرڈیننس سے پہلے اس قسم کی معمولی جسمانی مشکلات کو کبھی معذوری کے ذیل میں نہیں لایا جاتا تھا۔ اس صورت حال میں مستحق معذورین اپنے حق سے بالکل محروم ہوجاتے ہیں اور آرڈیننس کا مقصد ہی سرے سے فوت ہوجاتا ہے۔ بعض اداروں نے آرڈیننس کی پابندیوں سے بچنے کے لئے ایسے حضرات کی فہرست پیش کرنا شروع کردی ہے جو آرڈیننس

کے نفاذ کے بہت پہلے سے ملازمت کرتے تھے یہ صورت حال بھی کسی طرح قابل قبول نہیں ہونی چاہئے اور اس طرح کی صورت حال کا نوٹس لیا جانا چاہئے۔

اس ضمن میں ایک تجویز یہ بھی ہے کہ معذورین کی چھ بڑی اقسام کے لئے ملازمتوں کے کوٹہ میں ان کی آبادی کے مطابق گنجائش ہونی چاہئے تاکہ ہر معذور کو اس کا صحیح حق مل سکے۔

بہرکیف متذکرہ بالا آرڈیننس معذورین کے لئے ایک انتہائی حوصلہ افزا قدم ہے۔ جسے ہر مکتبہ فکر نے مستحسن قرار دیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی روح کو مجروح نہ ہونے دیا جائے۔ مزید برآں معذورین کو اس کوٹے کے علاوہ آزادانہ طریقے سے بھی مسابقت کا موقع فراہم کیا جائے تاکہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا جاسکے۔ اگر ایک معذور ایک عام شہری کی طرح ملازمت کے لئے درخواست گزارتا ہے اور ان تمام مراحل سے بخیر و خوبی گزر جاتا ہے جو متعلقہ ملازمت کے لئے ضروری ہوں تو پھر ایسے شخص کو ایک فی صد کوٹہ میں شامل کرنے کا کوئی جواز ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً" بعض پسماندہ علاقوں کے لئے کوٹہ مقرر ہے لیکن پسماندہ علاقوں میں رہنے والوں کو عام طریقے سے مسابقت کرنے سے منع نہیں کیا جاتا ہے۔ ایک پسماندہ علاقے میں رہنے والا شخص ایک ترقی یافتہ علاقے میں رہنے والے شخص کی طرح Competition میں حصہ لیتا ہے اور صرف وہی افراد کوٹہ کی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو Direct Competition میں نہیں آسکتے۔ چنانچہ ہماری رائے ہے کہ

معذورین کے سلسلے میں یوں بھی یہی طریقہ کار اپنایا جانا چاہیے۔ صرف اسی طرح آرڈیننس کی روح کو قائم رکھا جاسکتا ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ ابھی آرڈیننس پر عمل شروع ہی ہوا ہے وقت کے ساتھ ساتھ اور عملی مشکلات بھی سامنے آسکتی ہیں جنہیں وسیع تر انسانی جذبے کے پیش نظر حل کیا جانا چاہیے اور اس سلسلے میں معذورین سے متعلق تنظیموں کی آراء کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہیے۔

نابینا افراد کی انکے اپنے علاقوں میں بحالی سے متعلق چند تجاویز

بے روزگاری ہمارے ملک کے لئے زندگی اور موت کا سوال بن گئی ہے تعلیم بڑھتی جا رہی ہے مگر تعلیم یافتہ اور ہنر مند افراد کے لئے ملازمت کے دروازے بند ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بہت سا کام جو انسانی ہاتھ اور انسانی ذہن کرتا تھا مشینوں نے سنبھال لیا ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے ملک میں پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف رجحان میں وہ اضافہ نہیں ہوا جو عہد حاضر میں انتہائی ناگزیر تھا۔ عام طور پر ایف اے' بی اے اور ایم اے کی ڈگریز حاصل کر لی جاتی ہیں اور اس کے بعد ملازمتوں کے لئے کوششیں شروع ہوجاتی ہیں اور نتیجہ عام طور پر مایوسی اور افسردگی کی صورت میں نکلتا ہے۔

یہ تو حال ہے ان حضرات کا جنہیں کوئی معذوری نہیں جن کے پانچوں حواس بالکل درست حالت میں ہیں چنانچہ نابینا افراد کے لئے یہ مسئلہ اور بھی سنگین ہوجاتا ہے اور وہ مایوسی کا کچھ اس طرح شکار ہوتے ہیں کہ انہیں کوئی راہ ہی سجھائی نہیں دیتی۔ ہمارے ادارے سے فارغ التحصیل کئی ایک طلباء میٹرک اور ایف اے کر گئے ہیں اور اب وہ ملازمت کے لئے

لگے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ یہ کسی کے اختیار میں نہیں کہ فی الفور ملازمت کے احکام ان کے ہاتھ میں تھما دیئے جائیں۔ تاہم ہمارا خیال ہے کہ اگر معاشرہ اس مسئلے پر مثبت انداز سے غور کرے اور واضح اقدام اٹھانے کا فیصلہ کرے تو نابینا حضرات کا مسئلہ بھی بڑی حد تک حل ہوسکتا ہے ہم یہاں حکومت کی طرف سے ملازمتوں کے ایک فی صد کوٹہ کا ذکر نہیں کریں گے اگرچہ اس رعایت پر عمل سے نابینا افراد کے مسائل ایک حد تک حل ہوسکتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ کسب معاش کے تمام دروازے بند نہیں ہوئے ابھی بہت سی صورتیں باقی ہیں جن سے امید کی کرن پھوٹتی ہے بشرطیکہ من حیث القوم ہم یہ فیصلہ کرلیں کہ ہمیں ان افراد کی بچ مچ مدد کرنا ہے اس سلسلے میں ہمارا خیال ہے کہ خود اپنے علاقوں میں نابیناؤں کی بحالی ممکن ہے مثلاً" یہ کہ دیہات میں نابینا افراد کو زراعت کے پیشے سے منسلک کیا جاسکتا ہے اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں نابینا افراد اپنے بینا اعزہ و اقرباء کے تعاون سے زراعت کے پیشہ سے اپنا کردار ادا کرسکتے ہیں۔ وہ فصلوں کو پانی لگا سکتے ہیں زمین کو ہموار کرسکتے ہیں' گھاس کاٹ سکتے ہیں' جانوروں کی حفاظت کرسکتے ہیں' بیج بو سکتے ہیں' لیکن اس کے لئے تھوڑی سی تربیت کی ضرورت ہے اور اس اعتماد کی بھی جس کا نابینا افراد میں باوجوہ فقدان ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں ہمارا خیال ہے کہ یہ فیصلہ کر لیا جانا چاہئے کہ شہراور دیہات کی تمام مساجد میں اگر نابینا حفاظ اور قراء دستیاب ہوں تو ان کی ہی خدمات حاصل کی جائیں اس طرح کئی ایک نابینا افراد کی بحالی ممکن ہوسکے گی۔ تعجب کی

بات یہ ہے کہ ہر نابینا کو دیکھتے ہی حافظ تو تصور کر لیا جاتا ہے لیکن جو حضرات سچ مچ حافظ قرآن ہوتے ہیں انہیں مساجد سے منسلک نہیں کیا جاتا' کتنی بڑی ستم ظریفی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ہمیں بحیثیت قوم کچھ اہم فیصلے کرنا پڑیں گے۔ ان میں ایک فیصلہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ کام جو نابینا افراد آسانی سے کرسکتے ہیں انہی سے لیا جائے۔ مثلاً" کرسیاں اور چارپائیاں بننا اور چکیں بنانا وغیرہ۔ یہ کام سالہا سال سے نابینا حضرات کرتے آ رہے ہیں۔ افراد اور اداروں کو یہ فیصلہ کرلینا چاہئے کہ جہاں کہیں یہ سب کام کرنے والے نابینا افراد موجود ہیں یہ کام انہی سے کرایا جائے۔ یہ سچ ہے کہ بینا افراد بھی بے روزگاری کا بری طرح شکار ہیں لیکن ان کے سامنے کام کرنے کے بہت سے دیگر امکانات بھی ہوتے ہیں اور نابیناؤں کے لئے مواقع کم و بیش نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس سلسلے میں نابینا افراد کے لئے انجمنیں ورکشاپس قائم کرسکتی ہیں جہاں یہ افراد اکٹھے ہوسکتے ہیں اور انہیں کام آسانی سے مہیا کیا جاسکتا ہے اگر کہیں نابینا افراد کی انجمنیں فعال نہ ہوں تو میونسپل کمیٹی اور یونین کونسل جیسے بلدیاتی ادارے اس طرح کی ورکشاپس کا اہتمام کرسکتے ہیں۔

مندرجہ بالا اقدام عام طور پر ہنر مند افراد کی بحالی میں مد ثابت ہونگے

سکھائے اور ان کی رہنمائی کرے یہ تجربہ مغربی ممالک میں تو ہو ہی رہا ہے پاکستان میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ منصوبہ بندی سوچ سمجھ کر کی جائے اور نابینا افراد کے لئے انجمنوں سے مشاورت کو اہمیت دی جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ تعلیم یافتہ نابینا حضرات پرائیویٹ کوششوں کے ذریعے بھی اپنی اقتصادی بحالی کا اہتمام کرسکتے ہیں۔ آج کل ہمارے ملک میں نج کاری کا ذکر عام ہے بلکہ اصحاب علم و دانش اس نتیجہ میں پہنچے ہیں کہ تمام قومی اداروں کو عوام کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ ذاتی دلچسپی لے کر انہیں چلائیں اس سلسلے میں بعض تجربے انتہائی کامیاب رہے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ایسے تجربات کامیابی کے بے پناہ امکانات رکھتے ہیں تعلیم یافتہ نوجوان پرائیویٹ ادارے قائم کرسکتے ہیں اور اس طرح تعلیم و تدریس کے مقدس پیشے کو اختیار کرسکتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی زیادہ مالی اخراجات بھی نہیں اٹھتے مزید برآں نابینا افراد کی انجمنیں ایسا اہتمام کرسکتی ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ نابینا افراد اپنی انجمنوں کو مضبوط کریں اور معاشرہ آگے بڑھے اور ان کی بحالی کو اپنا فرض اولیں قرار دے۔ ایک معذور شخص بے روزگاری کی حالت میں معذور تر ہوجاتا ہے اور اس کی مایوسی بسا اوقات اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوتی ہے وہ اخلاقی جرأت کھو بیٹھتا ہے اس طرح گداگری جنم لیتی ہے خواہ اس کی صورت کچھ بھی ہو ہمارا خیال ہے کہ اگر ان چند تجاویز کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو نابینا افراد کی بے روزگاری کو بڑی حد تک ختم کیا جاسکتا ہے۔



نابینائی کے مسائل اور ابلاغِ عامہ کی ذمہ داریاں

کہتے ہیں کہ یہ دور پبلسٹی اور پروپیگنڈے کا دور ہے لیکن مجھے یوں لگتا ہے کہ ہر دور پبلسٹی اور پروپیگنڈے کا دور ہی رہا ہے ہاں اتنا فرق ضرور آگیا ہے کہ اب یہ سب کچھ کرنا قدرے آسان ہوگیا ہے لیکن آسانیاں ان کے لئے ہیں جو مال و منال رکھتے ہیں' اثر و رسوخ کی نعمت سے بہرہ ور ہیں اور مسند سیاست پر جلوہ افروز ہیں لیکن وہ لوگ جو غربت کی چکی میں پس رہے ہیں اور بے زری اور بے دری کے عذاب سے گزر رہے ہیں ان کیلئے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ حالانکہ ذرائع ابلاغ کو ایسے حضرات کے مسائل کو منظر عام پر لانے میں پیش پیش ہونا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ ذرائع ابلاغ عامہ بالخصوص پریس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اسے ریاست کا چوتھا ستون کہا گیا ہے۔ لیکن کچھ ایسا ہوا کہ پریس نے باوجوہ وہ کردار ادا نہیں کیا جس سے شمع زندگی کی لو کو تیز کیا جاسکتا تھا اور زندگی کے مسائل کو کم کیاجاسکتا تھا یہی وجہ ہے کہ پریس ہمیشہ ہدف تنقید رہا ہے اس ضمن میں چند آراء نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

Lord North Cliff کے مطابق

" Journalism: a profession whose business it is to explain to others what it personally does not understand."

اور اسی طرح ایک اور مفکر G.K.Chesterton کی رائے میں

" Journalism largely consists in saying 'Lord John's dead' to people who never knew Lord John was alive."

اسی طرح Adlion Stevenson کے مطابق

" News paper editiors are men who separate the wheat from the chaff and then print the chaff."

یہ تمام آراء اخبارات پر کڑی تنقید کی غماز ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اچھی صحافت اہم کردار ادا کرسکتی ہے تحریک پاکستان کے دوران میں صحافت کا کردار قابل رشک رہا اور اسی طرح بعض حالات میں اخبارات نے انتہائی بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اخبارات کے اعلیٰ معیار کا انحصار قارئین کی ذہنی استعداد پر بھی ہے کسی نے کہا تھا۔

" Along with responsible News papers, we must have responsible readers."

بہرکیف نابینائی کے مسائل کے حوالہ سے اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ عامہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان ذرائع کے کچھ اپنے مسائل رہے ہیں اور ہمیشہ اہمیت سیاستدانوں اور حکمرانوں کو حاصل رہی ہے زندگی کے مسائل کی طرف اخبارات کی توجہ بہت کم رہی ہے' بالخصوص ایسے مسائل کی طرف جو باوجوہ سامنے ہی نہیں آپاتے۔ اخبارات میں نابیناؤں سے متعلق اکا دکا خبریں تو کبھی کبھار دیکھنے میں آجاتی ہیں لیکن ان کے مسائل پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

کئی سال سے میں پندرہ اکتوبر کو بالخصوص بہت سے اخبارات کو پڑھتا ہوں کہ ان میں اس دن کی مناسبت سے کیا کچھ چھپا ہے کیونکہ یہ دن نابیناؤں کے عالمی دن کے طور پر منایا جاتا ہے' لیکن بہت کم اخبارات میں کوئی تفصیلی مضمون چھپا ہوتا ہے اگر ایک آدھ مضمون ہوتا بھی ہے تو وہ صرف سطحی صرف اس دن سے متعلق صدر اور وزیراعظم وغیرہ کا پیغام ہی چھپا ہوتا ہے۔

بذات خود میں نے کئی اخبارات کو تفصیلی مضامین ارسال کئے لیکن ایک

آدھ اخبار کے سوا انہیں کسی نے لائق اشاعت نہیں سمجھا۔ یہ ممکن ہے کہ میرے پینتیس سال کے نابینائی کے ذاتی تجربے کے باوجود اور نابیناؤں کے نمائندہ ہونے کےباوجود بھی یہ مضامین ہمارے قومی اخبارات کے معیار پر پورے نہ اترتے ہوں تو پھر جب یہ اخبارات مختلف مواقع پر ذاتی کوشش سے بڑے بڑے مضامین تحریر کرواتے ہیں تو پندرہ اکتوبر کے حوالے سے ایسا ممکن کیوں نہیں۔اگر سنجیدہ کوشش کی جائے تو بہت اچھے قلم کار مل سکتے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نابیناؤں کے عالمی دن کے موقع پر بھی پریس اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا۔ ریڈیو اور ٹی وی بھی اس دن پر ایک مختصر سا پروگرام پیش کرکے اس بھاری ذمہ داری سے اپنے آپ کو سبکدوش سمجھتے ہیں یہ حال تو نابیناؤں کے عالمی دن کا ہے عام دنوں میں تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان کے مسائل کو منظر عام پر لانے کی باقاعدہ کوشش موجود ہو۔ ریڈیو پاکستان لاہور نے نابینا حضرات کے لئے "ہمت والے لوگ" کے نام سے کوئی آدھ گھنٹے کا پروگرام پیش کیا ہوا ہے۔ جس میں بریل میں لکھے گئے خطوط کا جواب

دیا جاتا ہے اور کسی ایک نابینا شخص سے انٹرویو کیا جاتا ہے یہ کوشش مستحسن ہے لیکن اس حقیقت سے انکار کرنا بہت مشکل ہوگا کہ ریڈیو پاکستان لاہور نے اس سلسلے میں کسی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ عام طور پر لاہور ہی میں رہنے والوں کے انٹرویوز کر لئے جاتے ہیں یا کوئی خود وہاں پہنچ کر اپنا انٹرویو ریکارڈ کروا آتا ہے حالانکہ ریڈیو پاکستان لاہور کے نمائندے کم و بیش ہر شہر میں موجود ہیں اور انہیں یہ ذمہ داری تفویض کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے علاقوں میں نابیناؤں کے انٹرویوز ریکارڈ کریں یا انہیں لاہور بھیجنے کا اہتمام کریں اور وہاں کے نابیناؤں کے لئے تنظیموں کی سرگرمیوں کے بارے میں رپورٹس تیار کرکے پروگرام پروڈیوسر کو روانہ کریں۔ یقیناً اس پر کچھ خرچ ضرور اٹھے گا لیکن ایسے اخراجات جائز اخراجات متصور ہونگے۔ "ہمت والے لوگ" پروگرام کے حوالے سے ایک انتہائی قابل افسوس امر یہ ہے کہ اب اسے لاہور نمبر1 کی بجائے لاہور نمبر2 سے پیش کیا جاتا ہے جسے صرف لاہور کے قرب و جوار ہی میں سنا جاسکتا ہے۔

اسی طرح ریڈیو پاکستان اسلام آباد سے ایک ہفت روزہ پروگرام بعنوان "آپ کے ساتھ ساتھ" پیش کیا جاتا ہے جس میں مختلف معذورین سے کبھی کبھی کبھار انٹرویو کر لیا جاتا ہے لیکن یہ پروگرام ایسے وقت پیش ہوتا ہے جبکہ اسے بہت کم لوگ سن پاتے ہیں اسی طرح کے کچھ پروگرام بعض دیگر ریڈیو اسٹیشنوں سے بھی پیش کردیئے جاتے ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ مسائل کی شدت کے پیش نظر اس طرف زیادہ توجہ دی جائے۔

رہا ٹی وی کا معاملہ اس کی تو مصروفیات ہی بہت زیادہ ہیں۔ ڈرامہ اور فیچر

فلموں سے ہی اسے فرصت نہیں۔ کبھی ٹی وی پر گونگے بہروں کے لئے پروگرام "بولتے ہاتھ" پیش کیا جاتا تھا اب وہ بھی پیش نہیں ہوتا۔ نابیناؤں کے لئے تو سرے سے اس طرح کا کوئی پروگرام ہی ترتیب نہیں دیا گیا ہمارے دور میں بالخصوص شہری آبادی میں ٹی وی اہم ذریعہ ابلاغ بن گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ٹی وی کے ارباب اختیار نابیناؤں کے مسائل کو پیش کرنے میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں۔ کبھی کبھی ریڈیو کی طرح ٹی وی پر بھی نابیناؤں سے متعلق چند سلوگنز پیش کئے جاتے رہے ہیں لیکن اب تو کبھی وہ بھی دکھائی نہیں دیئے۔

یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ملک میں کم و بیش پندرہ لاکھ بے بصر حضرات موجود ہیں اور عوامی غلط رویوں کے باعث ان کی زندگی سراپا مسائل بن کر رہ گئی ہے۔ کوئی بھی انہیں اول درجہ کا شہری تصور کرنے کو تیار نہیں۔ اپنے ترحم کے چند الفاظ ادا کرکے ہر کوئی اپنے آپ کو سرخرو محسوس کرتا ہے لیکن زندگی کی مشکل راہوں پر انہیں تنہا سفر کرنا پڑتا ہے۔ سوچئے بینائی کے بغیر نشیب و فراز سے بھرپور راہوں پر تن تنہا چلنا کتنا مشکل ہوگا۔ ہماری زندگی ویسے ہی ایک نفسیاتی عارضہ بن کر رہ گئی ہے۔ خود غرضیوں نے زندگی سے اس کا سارا حسن چھین لیا ہے اور اسے آشوب و کرب کی ایک جیتی جاگتی تصویر بنادیا ہے لیکن پھر بھی بینا حضرات کسی نہ کسی طرح اپنی راہ تلاش کر ہی لیتے ہیں لیکن ان

پیب ۔ ایک تحریک

ایک زمانہ تھا کہ یہ بحثیں ہوا کرتی تھیں کہ بینائی سے محروم افراد زندگی میں کچھ کر بھی سکتے ہیں یا نہیں اور جب کوئی یہ کہا کرتا تھا کہ انہیں تعلیم کے زیور سے آراستہ و پیراستہ کیا جاسکتا ہے تو بڑے بڑے تعلیم یافتہ اشخاص حیرت اور استعجاب کی تصویر بن جایا کرتے تھے اگر کوئی نابینا حافظ قرآن تلاوت کرتا تو "اللہ کی شان" جیسے الفاظ اکثر سننے میں آیا کرتے تھے۔ آج سے کوئی پینتیس سال پہلے خوشاب کی ایک مسجد میں ایک نابینا امام صاحب تھے جنہیں مسجد میں ایک حجرہ بھی ملا ہوا تھا وہ نماز پڑھاتے اور پھر اس حجرے میں تشریف لے جاتے' میں بھی انہیں ملنے جایا کرتا تھا وہ اکثر و بیشتر اندازے سے صحیح وقت بتا دیا کرتے تھے اور یہ اہل محلہ کیلئے ایک تعجب کی بات ہوا کرتی تھی لیکن انہیں کہاں معلوم تھا کہ ان حافظ صاحب کے پاس نماز پڑھنے کے علاوہ وقت کو ناپنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا یہ وہ دور تھا جب نابیناؤں کا عام تعلیم حاصل کرنا عوام الناس کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا تھا بہرحال پاکستان میں ایک دو ادارے موجود تھے جہاں نابینا بچوں کو ہنر سکھایا جاتا تھا اور تعلیم دی جاتی تھی لیکن تعلیم دینے والے عام طور پر بینا اشخاص ہوتے تھے۔ یہی بڑی بات تھی کہ نابینا اپنے جیسے بے بصر دوستوں میں رہ کر زندگی کے غم بھول جاتے تھے خوش و خرم رہنا سیکھ جاتے

تھے' اسکے علاوہ انکے سامنے کوئی منزل نہ تھی چند سال ان اداروں میں کچھ ہنر سیکھنے کے بعد انہیں ورکشاپ میں روزانہ اجرت کی بنیاد پر کام دے دیا جاتا تھا۔

انکے سامنے کوئی مستقبل کے خواب تھے نہ کوئی آرزوئیں نہ یہ تصور کہ وہ ایک عام شہری کی طرح زندگی گزار سکتے ہیں انکے کوئی مطالبات نہ تھے کوئی تنظیم نہ تھی' کوئی ستاون اٹھاون کی بات ہے کہ کوئی صاحب یورپ سے آئے اور انہوں نے اندرون شیرانوالہ گیٹ لاہور میں قائم شدہ نابینا بچوں کے سکول کا معائنہ کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ نابینا بچے پاکستان کے سیاق و سباق میں تعلیم کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے' چنانچہ اس سکول کو چار جماعت تک کی بجائے دو جماعت کا سکول کر دیا جائے کیونکہ دو سال میں بچے کرسیاں بننا اور چکیں بنانا باسانی سیکھ سکتے ہیں اور پھر کام شروع کر سکتے ہیں اس تجویز کے خلاف سکول میں ایک شدید ردعمل ہوا اور ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ غالباً" اس صورت حال نے پہلی بار نابینا بچوں اور نابینا اساتذہ کو کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ پھر اس کے بعد امریکہ سے ایک نابینا خاتون ڈاکٹر گرانٹ پاکستان آئیں اور انہوں نے امریکہ میں نابیناؤں کی سرگرمیوں سے

کی تند و تیز آندھیوں میں کبھی جلتی کبھی بجھتی۔ آہستہ آہستہ شعور بیدار ہونے لگا اور یہ قندیل ایک دمکتاہوا ستارہ بن گئی۔ دراصل اس تنظیم کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ نابینا افراد کو رہنے سہنے لکھنے پڑھنے اور باعزت زندگی گزارنے کے وہی مواقع ملنے چاہئیں جو بینا افراد کو ہیں لیکن اس کے منشور میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ نابیناؤں کے مفادات کی سب سے مؤثر ترجمانی صرف خود نابینا ہی کر سکتے ہیں۔ اس تنظیم سے قبل کچھ ایسی تنظیمیں تھیں جو نابیناؤں کی فلاح وبہبود کے لئے سرگرم عمل تھیں جنہیں فار دی بلائنڈ کہا جاتا تھا لیکن ان فار دی بلائنڈ تنظیموں میں ان نابینا افراد کی اول تو نمائندگی تھی ہی نہیں اور اگر تھی بھی تو آٹے میں نمک کے برابر' ان تنظیموں کے نمائندگان کا خیال تھا کہ نابینا افراد اپنی فلاح وبہبود کے بارے میں کچھ بھی کرنے سے قاصر ہیں اور یہ کہ صرف اور صرف بینا افراد ہی کا فرض ہے کہ وہ انکے لئے پالیسیاں وضع کریں۔ پیب نے یہ موقف اختیار کیا کہ نابینا افراد کو اپنے بینا احباب کی مدد و تعاون کی تو ہمہ وقت ضرورت ہے لیکن انکے اصل مسائل کیا ہیں وہ مختلف مراحل میں کن تجربات سے گزرتے ہیں کس طرح کی تعلیم و تربیت انکے لئے ضروری ہے اور کس طرح وہ فعال شہری کی صورت میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں ان تمام امور کا فیصلہ صرف نابینا افراد ہی کر سکتے ہیں۔

کوئی ۱۹۶۹ء کی بات ہے کہ میں ایک وزیر تعلیم سے نابیناؤں کے تعلیمی مسائل پر گفتگو کر رہا تھا تو پاس سے ایک بظاہر پڑھے لکھے صاحب فرمانے لگے۔

" If a blind leads a blind' both

will fall into a ditch "

یہ الفاظ بائبل میں میں نے بھی پڑھ رکھے تھے لیکن بائبل کا تخاطب نابیناؤں سے نہیں بلکہ ذہنی طور پر نابیناؤں سے ہے بہر کیف عیب کو یہ بات منوانے میں پندرہ بیس سال لگ گئے۔ آہستہ آہستہ یہ بات تسلیم کی جانے لگی کہ نابیناؤں کی یہ تنظیم انکی نمائندہ تنظیم ہے اور خود تنظیم نے اپنی سرگرمیوں سے واضح کر دیا کہ نابینا حضرات خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں اور دیگر نابینا افراد کو بھی سہارا دے سکتے ہیں انکے مسائل حل کر سکتے ہیں انکی بھرپور ترجمانی کر سکتے ہیں۔

آج بحمد للہ کراچی سے پشاور تک اس تنظیم کی ضلعی سطح تک شاخیں موجود ہیں جنھوں نے اپنے وسائل کے مطابق بہت سے منصوبے شروع کر رکھے ہیں نابینا بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے انہیں مختلف دستکاریاں سکھائی جاتی ہیں اور پھر انکی آباد کاری کا ہر ممکن اہتمام کیا جاتا ہے۔ ضلعی انجمنیں ایک صوبائی کونسل کی صورت میں ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور تمام صوبے مرکزی کونسل کے ساتھ وابستہ ہیں جسکا صدر دفتر کراچی میں ہے۔

کرنا چاہئے بلکہ ملکی پیمانے پر تمام منصوبہ جات پر اصل نگرانی اور انتظام اس تنظیم کا ہی ہونا چاہئے۔ لیکن شومئی قسمت ایسا نہیں ہوا حکومت نے سپیشل ایجوکیشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے جسکے ذریعے سے کروڑوں روپے بظاہر نابیناؤں کی تربیت کے لئے خرچ کئے جاتے ہیں لیکن وہ لوگ جو اس ادارے سے منسلک ہیں انہیں نہ تو نابیناؤں کے مسائل سے آگہی ہے اور نہ ہی طریقہ کار سے۔ وہ اپنے دفاتر میں بیٹھ کر معمول کے مطابق احکام صادر کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کروڑوں روپے خرچ کئے جانے کے باوجود نابینا افراد کے لئے چند تعلیمی ادارے بلڈنگز کی صورت میں موجود ہیں لیکن انکے اندر صورت حال کیا ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ وہاں نابینا طلباء کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسکے مقابلے میں ہیب کی شاخوں کے زیر انتظام چلنے والے اداروں میں نابینا طلباء کی تعداد کہیں زیادہ ہے اور انہیں کے ادارے تعلیم یافتہ اور ہنر یافتہ اشخاص کی آباد کاری میں لگے ہوئے ہیں۔

ان تنظیموں کے وسائل انتہائی کم مگر حوصلے بہت بلند ہیں اگر ارباب بست و کشاد ہیب کی روح کو سمجھ سکیں اور اس کی سرگرمیوں سے آگہی حاصل کر سکیں تو پاکستان میں لاکھوں بے بصر افراد کی زندگیوں میں ایک انقلاب آسکتا ہے لیکن لگتا کچھ یوں ہے کہ ہمارے ارباب بست و کشاد چونکہ خود بھی بینا ہیں اس لئے انکے ذہنوں میں اب بھی یہ تعصب موجود ہے کہ صرف آنکھ ہی سے زندگی کو دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے لیکن حقیقت

یہ ہے کہ جب آنکھ دیکھنا بند کردیتی ہے تبھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیکھنے والی آنکھ اور نہ دیکھنے والی آنکھ کے نقطہ نظراور زاویہ فکر میں کتنا فرق ہے۔

عام ادارے اور نابینا ملازمین

بحمد للہ اس قدر سوجھ بوجھ پیدا ہوگئی ہے کہ باصلاحیت نابینا افراد عام اداروں میں کامیابی سے اپنے فرائض سرانجام دیتے نظر آتے ہیں ایک زمانہ تھا اور وہ بھی کوئی دور کا نہیں جب یہ تصور بھی محال تھا کہ نابینا افراد بینا افراد کے ساتھ مل جل کر اپنے فرائض منصبی خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتے ہیں جب مجھے حصول معاش کے لئے کوششیں کرنا پڑیں تھیں تو مجھے یاد ہے کہ کسی کی یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود تعلیم کے شعبے سے منسلک ہوسکتا تھا تاہم حالات کچھ اس طرح میرے حق میں ہوتے گئے کہ مجھے کسی کالج میں پہلا نابینا لیکچرر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا لیکن یہ ممکن کیسے ہوا یہ بڑی طویل داستان ہے مجھے اکثر حضرات کہا کرتے تھے کہ میرے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہوگا کہ بغیر بینائی کے طلباء کی ایک بہت بڑی تعداد کو قابو میں رکھ سکوں بہرحال سارے خدشات محض خیالی تھے کیونکہ کسی کی صلاحیتوں کو جانچنے کے لئے آزمائش شرطِ اول ہے بہرکیف جب سلسلہ چل نکلا تو بہت سے نابیناؤں کو سکولوں اور کالجوں میں ملازمتیں ملنے لگیں کئی ایک ٹیلی فون اپریٹر بنے' کچھ ٹائپسٹ بن گئے اور اس طرح مختلف شعبہ ہائے حیات میں نابینا افراد کو ملازمتیں ملنے لگیں پھر ملازمتوں میں ایک فی صد کوٹہ مقرر ہوگیا اور اس پر بھی کچھ نہ کچھ عمل ہوتا ہی رہا ہے اب عام اداروں میں بہت سے نابینا افراد اپنے فرائض

سرانجام دے رہے ہیں اول تو یہی بڑی بات ہے کہ ایسے معاشرے نے جس کے کبھی وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ بینائی کے بغیر بھی زندگی کے معمولات سرانجام دیئے جاسکتے ہیں یہ تو قبول کرلیا کہ ایسا ممکن ہے اور بذات خود یہ ایک بہت بڑی ذہنی تبدیلی ہے نہایت حوصلہ افزاء' خوش آئند لیکن معاشرے کو کچھ اور حقائق بھی ملحوظ خاطر رکھنے ہوں گے اس میں تو شک نہیں کہ باصلاحیت نابینا افراد زندگی کے دھارے میں داخل ہوگئے اور کاروان حیات کو آگے بڑھانے میں اپنے قلب و ذہن کی تمام تر صلاحیتوں صرف کر رہے ہیں۔ وہ بھی اپنے بینا ساتھیوں کی طرح عروس زندگی کی مشا طگی میں منہمک ہیں وہ بھی وطن عزیز کی تعمیرو ترقی میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ وہ بھی ایک فعال شہری کی طرح گوناں گوں خدمات سرانجام دے رہے ہیں اپنے خیالات اور اپنے کردار کی روشنی سے زندگی کو منور کرنے میں ہمہ تن محو ہیں اور اس طرح وہ نہ صرف خود کفیل ہیں بلکہ جانے کتنے افراد کو خود کفیل بنانے میں مصروف کار ہیں انسان بنیادی طور پر مدنی الطبع ہے وہ الگ تھلگ زندگی نہیں گزار سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مل جل کر رہنا سیکھ لیا ہے لیکن اس اجتماعی زندگی کے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ ملک کا دفاع بہت ضروری ہے اس لئے ہم افواج پاکستان کو عام شہریوں کے مقابلے میں زیادہ سہولتیں باہم پہنچانے پر یقین رکھتے ہیں ڈاکٹر حضرات معاشرتی صحت کی بقاء کے ضامن ہیں لیکن وہ شہری زندگی کو اپنانا چاہتے ہیں وہ دیہات میں فرائض سرانجام دینا نہیں چاہتے۔ اس لئے کئی

بار ایسی تجاویز سامنے آتی ہیں کہ انہیں مناسب Incentive ملنا چاہئے اور دیہات میں خدمات کے عوض انہیں خاص الاؤنس دیا جاتا ہے۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ نابینا حضرات کو کیونکر ملک کی ضروری خدمات سے مماثل قرار دیا جاسکتا ہے ہمارا موقف ہے کہ نابینا افراد اپنے فرائض تو سرانجام دیتے ہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ تحریک کا باعث بھی بنتے ہیں۔ میں نے جانے کتنے حضرات کو یہ کہتے سنا ہے کہ فلاں نابینا ہوتے ہوئے اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہے تو بینا افراد کیونکر ایسا نہیں کرسکتے اور پھر ہمارے خیال میں نابینا افراد اپنے فرائض جس خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ ان کے مسائل پر بھی توجہ دی جائے۔

معذورین کے لئے اداروں میں جو معذور حضرات فرائض سرانجام دے رہے ہیں انہیں کئی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں مثلاً" انہیں ایک گائیڈ الاؤنس دیا جاتا ہے علاوہ ازیں ان کے شرائط کار عام اداروں میں کام کرنے والوں سے کہیں بہتر ہیں حالانکہ ان کا اثر ایک محدود طبقے تک ہوتا ہے اور انہیں ان اداروں میں اکثر وبیشتر رہائشی سہولتیں بھی فراہم کردی جاتی ہیں' تاہم ہمارے خیال میں یہ قدم انتہائی اہم ہے کیونکہ ایسے اداروں میں کام کرنے والوں کی مشکلات بہرحال زیادہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہماری رائے میں وہ نابینا افراد یا معذورین جو عام اداروں میں کام کرتے ہیں انکی حوصلہ افزائی کی بھی سخت ضرورت ہے ایک نابینا استاد خواہ وہ سکول میں پڑھاتا ہو یا کالج میں عام اساتذہ کے مقابلہ میں زیادہ مشکلات کا شکار ہوتا ہے اسے

عام اساتذہ کی طرح کتب دستیاب نہیں ہوتیں۔ وہ کتاب جو بازار میں بیس پچیس روپے میں مل جاتی ہے اگر اسے بریل میں منتقل کیا جائے تو کوئی بیس پچیس گنا زیادہ خرچ اٹھتا ہے علاوہ ازیں ایک نابینا استاد کو اپنا لیکچر تیار کرنے کے لئے ایک ریڈر کی ضرورت بھی ہوتی ہے پھر اکثرو بیشتر اپنے تعلیمی ادارے میں اکیلا نہیں جاسکتا ابھی وقت نہیں آیا کہ وہ یورپ کی طرح کسی تربیت یافتہ کتے کو اپنے ہمراہ اپنے ادارے تک لے جائے اور اسے پھر بھی کوئی باعزت فرد تصور کرے بلکہ ابھی تو ایسا وقت بھی نہیں آیا کہ سفید چھڑی کے ذریعے ہی بحفاظت وہ اپنے تعلیمی ادارے میں بروقت پہنچ جائے اس طرح ایک عام استاد کے مقابلے میں اسے اپنا معیار زندگی مساوی رکھنے کے لئے کہیں زیادہ اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں ہر مہذب اور زندہ قوم کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ معاشرتی انصاف مہیا کرے اور معاشرتی انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ ایک بینا اور نابینا اہل کار کے معیار زندگی میں کوئی فرق نہ آنے پائے جبکہ دونوں کی صلاحیتیں ایک جیسی ہوں ممکن ہے کہ کسی ذہن میں یہ خیال گزرے کہ کیا یہ کم ہے کہ نابینا حضرات کو ملازمتیں ملنے لگی ہیں لیکن ایسا ذہن زندگی کے اصل تقاضوں سے ہم آہنگ متصور نہ ہوگا۔ کسی قوم کے مہذب ہونے کی سب سے قوی دلیل یہی ہوتی ہے کہ وہ ہر طاقتور اور کمزور کو مساوی مواقع مہیا کرے۔

پائے۔ کئی ممالک میں انہیں ٹیلی فون کے بل سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا
ہے۔ اس لئے نہیں کہ ان ممالک کے رہنے والے ان پر ترس کھاتے ہیں
بلکہ اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ نابینا فرد بینا فرد کے مقابلے میں
آمدورفت کے اخراجات کا متحمل نہیں ہوسکتا اور پھر اسے مقابلتاً زیادہ
مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بہت سے ممالک میں انہیں ذاتی گاڑی
خریدنے میں گراں قدر رعایت دی جاتی ہے اور اسی طرح کئی اور شہری
سہولیات فراہم کی جاتی ہیں یہ درست ہے کہ ہمارا ملک اقتصادی طور پر
پسماندہ ہے لیکن پسماندہ رہنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم سماجی
انصاف فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں اور مراعات کا غیر مساویانہ استعمال
کرتے رہے ہیں اس لئے ہمارے خیال میں عام اداروں میں معذور
ملازمین کو خصوصی سہولتیں فراہم کی جانی چاہئیں اور تمام ملازمین کے
مقابلے میں ان کے شرائط کار کو بہتر بنایا جانا چاہئے اگر معذور افراد اپنا
معیار زندگی بلند کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو وہ معاشرے کے لئے بے
پناہ اخلاقی تحریک کا باعث ہوں گے۔



نابینا افراد اور انکے اعزہ و اقرباء

ارسطو نے کہا تھا کہ انسان معاشرتی حیوان ہے ، گویا معاشرت کے بغیر انسانی جذبوں' صلاحیتوں' میلانات اور احساسات کی نشوونما ہی ممکن نہیں بلکہ انسان کی تمام حاجات اور ضروریات کا دارو مدار بھی ایک سماجی ڈھانچے کا رہین منت ہے۔ ایک بچے کے لئے اس کا اولین معاشرہ اس کا اپنا گھر اور اعزہ و اقرباء ہوتے ہیں جن کے زیر اثر وہ زندگی کے شب و روز گزارتا ہے اور آہستہ آہستہ شعور کی منزلیں طے کرتا ہے اور پھر بڑی حد تک من

جاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس انتہائی اہم پہلو کی طرف توجہ بہت کم دی گئی ہے قصبوں اور شہروں میں تنظیمیں کام کررہی ہیں تعلیم و تربیت کے لئے کچھ ادارے قائم کردیئے گئے ہیں جہاں نابینا افراد ایک اپنی دنیا بسا لیتے ہیں لیکن چند سال قیام کرنے کے بعد انہیں اسی ماحول میں جانا ہوتا ہے جہاں سے وہ آئے تھے اور پھر وہی بے بسی اور بے کسی کی فضا ان پر طاری ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عام طور پر نابینا افراد اور ان کے اعزہ و اقرباء میں کوئی تعمیری اور مثبت رشتہ استوار نہیں ہوتا بلکہ اکثر والدین اور اعزہ و اقرباء اپنے بے بصر بچوں کے بارے میں جو رویئے اختیار کرتے ہیں اس میں وہ افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کہیں تو معذور بچے کو معصومیت کی تصویر تصور کرلیا جاتا ہے اسے مجسمۂ بے بسی سمجھ کر ترحم کے جذبات کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی ہے اسے اپنی نظروں سے اک پل بھی دور نہیں کیا جاتا اور بے جا لاڈ اور پیار کے اظہار سے اس کی ذہنی نشوونما رک کر رہ جاتی ہے اور وہ "Spoilt Child" کا روپ دھار لیتا ہے اس میں طرح طرح کی غیر معمولی جبلیات نشوونما پانے لگ جاتی ہیں وہ یا تو بہت شرمیلا بن جاتا ہے یا غیر ضروری طور پر بے باک۔ کبھی کسی کی نہیں سنتا، ضد کئے جاتا ہے اپنے بڑوں کا احترام نہیں کرتا اور اس طرح اس کی شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے پھر وہی والدین جو اس پر تمام محبتیں نچھاور کرتے ہیں اس کو نفرت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں اور یوں یہ بچہ جو اب نوجوانی کی منزل میں داخل ہو چکا ہوتا ہے کسی کام کا نہیں رہتا اور اس کے برعکس ایسے والدین کی کوئی کمی نہیں جو بے بصر یا معذور بچوں کو اپنے لئے

بدنامی اور رسوائی کا باعث گردانتے ہیں اسے اپنے ساتھ کہیں لے کر نہیں جاتے بلکہ کسی سے اس کا ذکر تک کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ اسے کسی درس میں بھیج دیتے ہیں یا وہ از خود ذرا بڑا ہو کر گھر سے فرار ہو جاتا ہے اور کشکول گدائی تھامے سڑکوں پر آکھڑا ہوتا ہے کچھ ایسے والدین بھی ہیں جنکا یہ یقین ہوتا ہے کہ بے بصر بچہ کسی کام کا نہیں اگر وہ علم و ہنر سیکھ بھی لے تب بھی وہ اس کی صلاحیتوں کے معترف نہیں ہوتے۔

یہ دونوں رویئے انتہائی افسوس ناک ہیں اور معذور افراد کی زندگیوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک بھر میں کوئی ایسی تنظیم قائم کی جائے جو معذور افراد کے اعزہ و اقرباء کی ذہنی تربیت کا اہتمام کرے۔ یہ کام پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ جس کی شاخیں پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں بھی سرانجام دے سکتی ہے ابلاغ عامہ اس ضمن میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے تاہم یہ انتہائی ضروری ہے کہ اس ضمن میں کوئی واضح لائحہ عمل ترتیب دیا جائے تاکہ نابینا افراد کے لئے مختلف پہلوؤں سے جو کوششیں کی جارہی ہیں بار آور ثابت ہوں۔

میں نے کسی پرچے میں ایک دلچسپ مضمون پڑھا تھا جس میں بعض والدین کا حوالہ دیا گیا تھا اور تحریر تھا کہ ان والدین کا مطالبہ ہے کہ انکی مالی اعانت کی جائے انہیں اپنے معذور بچے کی دیکھ بھال کے لئے غیر معمولی کوشش کرنی پڑتی ہے اور پھر ایسا بچہ ان کے لئے اقتصادی طور پر بھی ممد نہیں ہوتا اپنے دیگر بھائی بہنوں کی طرح گھریلو مسائل میں ان کا ہاتھ نہیں

بتاتا۔ مزید برآں اپنے بچوں کی وجہ سے انہیں اپنے علاقے میں شرم کے مارے سر جھکا کر چلنا پڑتا ہے حکومت کو چاہئے کہ وہ ایسے والدین کی مالی مدد و اعانت کرے یہ اپنی نوعیت کا عجیب و غریب مطالبہ ہے اگرچہ ایک حد تک اس میں سچائی ہے کہ اگر کوئی والد اپنے طور پر اپنے معذور بچے کی تعلیم و تربیت کرنا چاہے تو اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اگر ایسا والد ملکی تنظیموں اور انجمنوں سے رابطہ قائم کرے تو اس کی بہت سی مشکلات حل ہوسکتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ معذور بچوں اور افراد کے اعزہ و اقرباء کی ذہنی تربیت انتہائی ضروری ہے اس کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نابینا افراد کے لئے انجمنیں معذور بچوں کے والدین کو بھی اپنا رکن بنائیں اور اس طرح ان کے ساتھ مل کر معذورین کی بحالی کے پروگرام ترتیب دیئے جائیں اگر ایسا ممکن نہ ہو تو خط وکتابت کے ذریعے ایسے والدین سے روابط بڑھائے جاسکتے ہیں اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ نابینا افراد کی تنظیمیں ایسی ٹیمیں تشکیل دیں جو نابینا افراد کے اعزہ و اقرباء سے روابط بڑھائیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اس اہم مسئلے کی جانب بہت کم توجہ دی گئی ہے نابیناؤں کی قومی تنظیم کے منشور میں اس کا بالخصوص کہیں ذکر نہیں اور نہ ہی اس ضرورت کو محسوس کیا گیا ہے کہ اس سلسلے میں عملی اقدام کئے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی تنظیم جتنی چاہے کوشش کرے حکومت اپنے وسائل کو جس طرح چاہے بروئے کار لائے اگر ماحول کی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوگی تو حکومتی اور رضا کارانہ سطح پر کی گئی تمام کوششیں اکارت

جائیں گی کیونکہ اصل مسئلہ ماحول کا ہے اگر ماحول گھٹا ہوا ہو تو ہر طرف گھٹن کا احساس ہوگا آپ آلودہ ماحول سے صحت کی توقع نہیں کرسکتے اور یہ بات انتہائی اہم ہے کہ والدین اور اعزہ واقرباء معذور افراد کے لئے ماحول ہی کا کام کرتے ہیں اس ماحول کو روشن خیال بنانا کہیں زیادہ ضروری ہے۔

نابینائی اور نصابیات

نابینائی دیگر معذوریوں کی طرح یقیناً ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اور اس امر سے کسی کو اختلاف بھی نہیں۔ عوام الناس تو ویسے ہی عام طور پر سمجھتے ہیں۔ کہ "آنکھیں گئیں جہان گیا" اور کسی بے بصر کو دیکھ کر وہ آہ بھرے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک یہ طرز عمل نابیناؤں کے حق میں کوئی فعال نیک نہیں اور نہ ہی اسے نابیناؤں کی تعلیم و تدریس اور بحالی میں کوئی مدد ملتی ہے لیکن اس سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ معاشرہ اس امر سے پوری طرح آگاہ ہے کہ نابینائی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے ہمارے خیال میں بھی ہماری تمام تر رجائیت کے باوجود نابینائی کی مشکلات اور دشواریاں اتنی ہیں کہ ان کے تصور ہی سے بعض اوقات عام آدمی پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے سوچنا یہ ہے کہ محض خوف زدہ ہو جانے سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتاچنانچہ نابیناؤں کیلئے تنظیمیں اور حکومت اپنے اپنے انداز سے کوشاں ہے کہ نابینائی کے مسائل کو کم کیا جائے اور نابیناؤں کو ایک عام زندگی گزارنے کے قابل بنایا جائے۔

اس ضمن میں عوامی رویوں کے تبدیل کرنے کی تو ضرورت ہے

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ نابینائی سے متعلق ان کی معلومات درست کی جائیں اور صرف اس طرح ہی ہم ان کے رویوں کو تبدیل کر سکتے ہیں اور ان میں ایک اجتماعی احساس ذمہ داری بیدار کر سکتے ہیں اس ضمن میں ابلاغ عامہ کی اپنی ذمہ داریاں ہیں لیکن ہمارے خیال میں ایک اور طریقہ کار انتہائی مفید ثابت ہو سکتا ہے اگر معاشرہ خلوص دل سے چاہتا ہے کہ معذوروں کے مسائل حل ہوں تو اسے ہر ممکن طریقے سے انہیں حل کرنے کی کوئی سبیل تلاش کرنی چاہئے۔ ہمارے خیال میں ہم جو کچھ اپنی نصابی کتابوں میں پڑھتے رہے ہیں اس کا ہم پر گہرا اثر مرتب ہوتا ہے اور وہ بات ہمارے شعور اور لاشعور کا جزولاینفک بن جاتی ہے چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی درسی کتب میں کسی نہ کسی سطح پر نابینائی سے متعلق یا دیگر معذوریوں کے بارے میں مواد شامل کریں ابھی حال تک بی اے کے انگریزی نصاب میں ایک مضمون THREE DAYS TO SEE تھا ہیلن کیلر نابینا تھی سن بھی نہیں سکتی تھی اور وہ بول بھی نہیں سکتی تھی امریکہ کی یہ خاتون اپنی تمام ترمشکلات کے باوجود ایک انتہائی کامیاب شخصیت کے طور پر ابھری اور اس نے امریکہ کے نابیناؤں کیلئے گراں بہا خدمات سرانجام دیں اپنے محولہ بالا مضمون میں وہ تحریر کرتی ہے کہ اگر اسے دیکھنے کیلئے تین دن مل جائیں تو وہ اپنی بینائی کی حسیت کو بروئے کار لاکر ان اشیاء کا مزید ادراک حاصل کرے جنہیں وہ بینائی کے بغیر محسوس

کرتی رہی ہے اس کے مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی حسیات کس قدر بیدار ہیں۔

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ انگریزی کیلئے تبدیل شدہ نصاب میں اس مضمون کو شامل نہیں کیا گیا نہ ہی کوئی اور ایسا مضمون شامل نصاب ہوا۔ ہمارے خیال میں اس مضمون کی بڑی اہمیت تھی اس لیے نہیں کہ یہ اپنی نوعیت کا کوئی واحد مضمون تھا بلکہ اس لیے کہ یہ مضمون پڑھاتے وقت اساتذہ کو موقع مل جاتا تھا کہ وہ نابیناؤں سے متعلق چند اطلاعات طلباء تک پہنچا دیتے تھے جس حد تک کسی استاد کو معلومات میسر ہوتی تھیں وہ انکی ترسیل میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتا تھا لیکن اب یہ تحریک بھی ختم ہوئی پہلی جماعت سے لیکر بی اے تک نصاب کا مطالعہ کر لیجئے کہیں بھی کسی معذوری کے متعلق کچھ بھی تحریر نہیں۔ نابیناؤں سے متعلق اکا دکا اشارے تو پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا ہیلن کیلر تو ایک امریکی خاتون تھی ہمارے ہاں ایسی شخصیات کی کمی نہیں جن کو داخل نصاب کر کے ہم نہ صرف معذورین کی حوصلہ افزائی کر سکتے ہیں بلکہ خود طلباء ان کی شخصیت سے تحریک حاصل کر سکتے ہیں مثلاً" ڈاکٹر طہ حسین ہی کو لے لیجئے جو بچپن ہی سے بینائی سے محروم ہو گئے اور پھر علم و ادب میں لازوال مقام حاصل کیا مصر کے وزیر تعلیم رہے اور ان کی کتب ان کی عظمت کا پتہ دیتی ہیں اسی طرح سعودی عرب کا نابینا شاعر علی شعلان ہے

جس کی خدمات کسی طرح کم نہیں اسی طرح ہمارے اپنے وطن عزیز میں ایسی شخصیات موجود ہیں جنھوں نے بچپن ہی میں بینائی سے محروم ہو کر علم و ادب میں گراں بہا خدمات سرانجام دیں اور جہد حیات میں بھرپور کردار ادا کیا ہم اپنے نصاب میں بریل سے متعلق کوئی مضمون شامل کر سکتے ہیں یا نابینائی، کسی نابینا شخصیت یا کسی اور معذوری سے متعلق مفید معلومات شامل نصاب کی جاسکتی ہیں ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اس سلسلے میں پہلے سے تحریر کردہ مضامین کی کمی ہے اول تو یہ موقف درست نہیں اور ہو بھی تو ایسے مضامین تحریر کرائے جا سکتے ہیں۔

پہلی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک نصاب کا مطالعہ کریں اس میں ضروری اور غیر ضروری ہر بات شامل ہے بعض مواد تو ایسا بھی ہے جسکی ضرورت ہی نہیں تو پھر یہ کیوں ممکن نہیں کہ معذوری سے متعلق معلومات کو نصاب کا حصہ نہ بنایا جاسکے ایسا انگریزی میں بھی ممکن ہے اور اردو میں بھی اور کسی اور مضمون میں بھی اسے شامل کیا جاسکتا ہے اگر ایسا کیاجاتا ہے تو ہمارے خیال میں اس کے اثرات انتہائی مفید مرتب ہونگے اور طلباء پر بھی اس کا گہرا اثر ہو گا اور اس طرح انہیں معلوم ہو سکے گا کہ جب ہم اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہیں تو ہمیں معذوری پر صرف آنسو بہانے کے بجائے عملی اقدام کرنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ جان سکیں گے کہ آج کا معذور اتنا معذور بھی نہیں اور نہ ہی اسے عذر

تلاش کرنے کی کوئی خواہش ہے جدید عہد نے اسے اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہے اپنی زندگی عزت اور وقار سے گزار سکتا ہے شرط یہ ہے کہ معاشرہ اسکی مدد کرے اسکی مشکلات کو اپنی مشکلات سمجھے اور اسے ابنارمل سمجھنے کی بجائے ایک نارمل انسان کی طرح اپنے اندر ضم کرلے۔

نابیناؤں کی علمی آنکھیں "بریل"

بینائی کے چھن جانے کے بعد اب بھی قیامت ٹوٹ پڑتی ہے جبکہ نابینا افراد پڑھ لکھ سکتے ہیں ملازمتیں حاصل کرسکتے ہیں اور ایک کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں چلئے سب نہ سہی لیکن نابینا افراد میں سے کچھ ایسے ضرور ہیں جو معمول کی زندگی گزارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور پھر اس صلاحیت کو بروئے کار لاکر کامیاب زندگی گزارنے لگتے ہیں یہ صلاحیت قوت ارادی ہے لیکن قوت ارادی کو اپنے جوہر دکھانے کے لئے کوئی میدان تو چاہئے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں اس کا امکان یورپ میں بھی بہت کم تھا۔ نابیناؤں کے لئے چند ادارے تھے لیکن انکی حالت ناگفتہ بہ تھی بہر کیف اسی صدی کے ربع اول میں ایک ایسی نابینا شخصیت پیدا ہوئی جس

نہ ہونے کے برابر تھا کیونکہ ابھی بریل کا انداز تحریر موجود نہیں تھا نابینا طلباء کے لئے ابھرے ہوئے حروف کی کتابیں تیار کی جاتی تھیں لیکن یہ طریقہ کار اس قدر دشوار تھا کہ اس طرح تیار شدہ کتب کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی جو کتابیں موجود تھیں انہیں بھی پڑھنا کوئی آسان نہ تھا ایک ایک حرف کوئی تین تین انچ کا ہوتا اور اس طرح ایک لفظ اور ایک جملے کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے نابینا بچہ آخری حرف کی شناخت کرتے تک یہ بھول ہی جاتا تھا کہ پہلے وہ کون سے حروف کی شناخت کر چکا ہے اس طرح حروف سے لفظ بنانا اور لفظوں سے جملے بنانا ایک معمے کو حل کرنے کے برابر تھا جسکی توقع نابینا بچوں سے کرنا عبث تھا ابھرے ہوئے حروف کے علاوہ نابیناؤں کے لئے مختلف طریقوں سے کتابیں تیار کرنے کی کوششیں بھی ہوتی رہیں مثلاً" کوشش کی گئی کہ پچکے ہوئے حروف سے کتب تیار کی جائیں بعض حضرات نے پتھر کے حرف تراشے' کسی نے رسی سے حروف بنائے' موم کے حروف تیار کئے گئے' لکڑی کو آزمایا گیا یہاں تک کہ پنوں سے بھی حروف تیار کئے گئے۔ لیکن کوئی طریقہ بھی کارگر نہ ہوا جس ادارے میں لوئی پڑھتا تھا اسکی لائبریری میں صرف چودہ کتابیں تھیں ان حالات میں کسی نابینا کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا محض ایک خواب تھا۔

ایک دن Capt.charles barbier اس ادارے میں گیا جہاں لوئی پڑھتا تھا اور نابینا بچوں کو وہ طریقہ کار سمجھایا جو اس نے اپنے سپاہیوں کو اندھیرے میں پیغام دینے کے لئے تیار کیا تھا اور جسے وہ "Night writing"

کہتا تھا اس کا خیال تھا کہ یہ طریقہ کار نابیناؤں کے لئے بھی کار آمد ہوسکے گا۔ اس طریقہ کار کے مطابق آوازوں کو مختلف ابھری ہوئی علامتوں میں پیش کیا گیا اور یہ علامتیں کاغذ پر ابھاری جاتی تھیں لیکن یہ طریقہ بھی نابیناؤں کے لئے مفید ثابت نہ ہوا۔ اس میں کیپیٹل حروف بنانے کا کوئی طریقہ موجود نہ تھا اور طویل تحریر کیلئے یہ قطعی طور پر نامناسب تھا اور بہت زیادہ جگہ گھیرتا تھا لوئی بریل اس طریقہ کار سے متاثر ہوا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کوئی ایسا طریقہ کار وضع کریگا جو نابیناؤں کے لئے کار آمد ہوسکے اس وقت اسکی عمر بارہ سال تھی اس نے مختلف طریقے آزمائے اور تین سال کی محنت شاقہ کے بعد اس نے چھ نقطوں کا طریقہ کار وضع کرلیا جسے اسکے نام کے حوالے سے بریل کہا جانے لگا۔

یہ عجیب بات ہے کہ شروع میں اس طریقہ کار کی مخالفت ہوئی لیکن

1	•	•	4
2	•	•	5
3	•	•	6

قارئین کی دلچسپی کے لئے انگریزی کے ۲۶ حروف درج ہیں۔

A.

1	•		4
2			5
3			6

B.

1	•		4
2	•		5
3			6

C.

1	•	•	4
2			5
3			6

D.

1	•	•	4
2		•	5
3			6

E.

1	•		4
2		•	5
3			6

F.

1	•	•	4
2	•		5
3			6

G 1 2 3 4 5 6

H 1 2 3 4 5 6

I 1 2 3 4 5 6

J 1 2 3 4 5 6

K 1 2 3 4 5 6

L 1 2 3 4 5 6

M 1 2 4 5

N 1 2 4 5

	1	•	•	4
Q·	2	•	•	5
	3	•		6

	1	•		4
R·	2	•	•	5
	3	•		6

	1		•	4
S·	2	•		5
	3	•		6

	1		•	4
T·	2	•	•	5
	3	•		6

	1	•		4
U·	2			5
	3	•	•	6

	1	•		4
V·	2	•		5
	3	•	•	6

	1		•	4
W·	2	•	•	5
	3		•	6

	1	•	•	4
X·	2			5
	3	•	•	6

	1	•	•	4
Y·	2		•	5
	3	•	•	6

	1	•		4
Z·	2		•	5
	3	•	•	6

بریل ایک انتہائی مفید طرز تحریر

ہے جس نے نابیناؤں کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کردیا ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت اور فلاحی ادارے بریل کے پریس قائم کریں اور ہر طرح کی کتب مہیا کی جائیں۔ بریل ایک باقاعدہ نظام تحریر ہے جس سے بینا حضرات بھی استفادہ کر سکتے ہیں سالہا سال سے سندھ کے سکولوں اور کالجوں میں بریل کو اختیاری مضمون کے طور پڑھایا جارہا ہے بینا طلباء کی ایک بہت بڑی تعداد بریل سیکھتی ہے وہ اس طرح نابیناؤں کے لئے کتب بھی تیار کرسکتے ہیں اور خود بھی استفادہ کرسکتے ہیں۔ بریل پڑھنے کے لئے روشنی کی کوئی ضرورت نہیں چنانچہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں جہاں بجلی کا کوئی اعتبار ہی نہیں ہوتا بریل بینا افراد کے لئے بھی مفید ثابت ہوسکتی ہے اور پھر عام طور پر پچاس سال کی عمر کے بعد بعض حضرات کی بینائی کمزور ہونے لگتی ہے۔ بریل اس صورت میں بھی مفید ثابت ہوسکتی ہے اور یورپ میں تو پچاس سال کے بعد بہت سے لوگ بریل ہی کو لکھنے پڑھنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اگر سندھ کی طرح پاکستان کے دوسرے صوبوں میں بھی بریل کو متعارف کرایا جائے اور اسے سکولوں اور کالجوں میں اختیاری مضمون کے طور پر پڑھایا جائے تو اس سے نابیناؤں کیلئے بڑی سہولت ہوسکتی ہے اور بینا حضرات بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ بریل کی افادیت کو محسوس کیا جائے اور اس میں زیادہ سے زیادہ کتب تیار کی جائیں۔

نابیناؤں کی اولاد کے مسائل

جس ترقی پذیر معاشرے میں ہم سانس لے رہے ہیں یوں تو یہ مسائل سے بھرپور ہے ہی لیکن کچھ مسائل خصوصی صورت حال کے تحت زیادہ اذیت ناک اور تکلیف دہ نظر آنے لگتے ہیں ان مسائل کی شدت میں خود شعوری یا لاشعوری طور پر بسا اوقات ہمارے اپنے عزیز و اقارب بھی اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ حریس نے کہا تھا کہ انسان انسان کا بدترین دشمن ہے اور یہی بات شیکسپیئر نے اپنے المیوں میں واضح کی ہے کہ انسان نے انسان کو اسکی بدترین حالت تک پہنچا دیا ہے۔ زمین و آسمان کی آفات ہی ہماری کمر توڑنے کیلئے کیا کم ہوتی ہیں کہ ہم اپنے عزیزوں اور اپنے احباب کے رویوں کا کچھ اس بری طرح شکار ہوجائیں کہ بعض اوقات جانبر بھی نہ ہو پائیں۔

میرے اس نقطۂ نظر کو قنوطیت پر معمول نہ کیا جائے۔ اگر مسائل کا معروضی مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت و اشگاف ہوتی ہے بقول شاعر۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

تاریخ بھی کچھ اسی طرح کے تلخ حقائق کی نشان دہی کرتی ہے اور ہمارا موجودہ عمرانی مطالعہ بھی کچھ اسی طرح کے حقائق پیش کرتا ہے۔

جہاں تک نابینا افراد کے مسائل کا تعلق ہے ان کا کوئی حد و شمار نہیں اور اسکی واضح وجوہات بھی ہیں جن سے ہر صاحب دل اور صاحب احساس کو بخوبی واقف ہونا چاہیئے وہ خاص مسئلہ جو اس وقت ملحوظ نظر ہے وہ نابینا افراد کی اولاد کا مسئلہ ہے۔ یوں تو اولاد کی تعلیم و تربیت ہمیشہ ایک بہت بڑا چیلنج رہی ہے اور ماں باپ اسی کوشش میں بسا اوقات اپنی جان' جان آفریں کے سپرد کردیتے ہیں لیکن جہاں تک بے گھر حضرات کا تعلق ہے تو یہ مسئلہ کچھ زیادہ ہی سنگین صورت اختیار کرلیتا ہے لیکن اسکی طرف کبھی کوئی خصوصی توجہ نہیں دی گئی۔ اول تو خود پچانویں فی صد نابینا افراد مجرد زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں حالانکہ انھیں معاشرے کے دیگر افراد سے کہیں زیادہ ازدواجی زندگی کی ضرورت ہے انہیں کوئی ایسا ساتھی ہر وقت درکار ہوتا ہے جو انکی مدد کرے ان کے دکھ اور سکھ میں ان کا ساتھی ہو ماں باپ آہستہ آہستہ اس پوزیشن میں نہیں رہتے کہ وہ بے بصر اولاد کی معاونت کرسکیں چنانچہ نابینا افراد اپنی رفیقہ حیات اور پھر اپنی اولاد کے حوالے ہی سے اپنی بعض مشکلات کو حل کرسکتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ابھی اتنا شعور بیدار نہیں ہوا کہ نابینا افراد کو ازدواجی زندگی نبھانے کا اہل تصور کیا جائے بہرکیف جہاں کہیں ایسا ممکن ہوگیا ہے وہاں بعض حالات میں بڑے حوصلہ افزا نتائج سامنے آئے ہیں لیکن میں

آپکی توجہ چند ایسے حقائق کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں جنہیں عام طور پر نظر انداز کیا گیا ہے یا کسی کے ذہن میں سرے سے ایسے مسائل کا احساس ہی پیدا نہیں ہوسکا۔یہ ٹھیک ہے کہ اگر نابینا افراد صاحب اولاد ہوجائیں تو ان کے کئی ایک مسائل حل ہوجاتے ہیں وہ اپنے بچوں کی مدد سے زندگی کے معمولات قدرے آسانی سے سرانجام دے پاتے ہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ بچے کی زندگی میں ایک بہت بڑا عرصہ ایسا ہوتا ہے جب اسے اپنے ماں باپ کی ضرورت ہوتی ہے ایک نابینا شخص جسے خود چلنا پھرنا سفید چھڑی کی مدد کے باوجود بھی ہمارے معاشرتی سیاق و سباق میں خاصہ مشکل ہوتا ہے اسکے لئے اپنی اولاد کی تربیت اور تعلیم کے فرائض سے عہدہ براء ہونا کس قدر دشوار ہوگا اس کا اندازہ لگایا ہی نہیں گیا ایک نابینا باپ اپنے بچے کو علاج معالجے کے لئے جب چاہے لے جا تو سکتا ہے اور پھر جب بچہ سکول میں داخل ہوتا ہے تو بینا والد کسی نہ کسی سواری پر بٹھا کر خود ادارے تک چھوڑ آتا ہے لیکن نابینا باپ کے لئے یہ ایک اضافی ذمہ داری ہوتی ہے اسے بہرطور کسی سواری کا بندوبست کرنا پڑتا ہے اور آج کی ہوشربا گرانی میں سواری کا اہتمام خاصا مشکل ہوتا ہے۔ صحت اور تعلیم کے مسائل تو ہیں ہی ویسے بھی زندگی کے معمولات میں بہت سے کام سرانجام دینا ہوتے ہیں پھر ہمارے معاشرے میں نابینا افراد کے لئے معاش کا مسئلہ ویسے ہی بڑا گھمبیر ہے وہ اپنی زندگی جانے کن کن مصائب سے دوچار ہوکر گزارتا ہے اسکی امید اسکی اولاد ہوتی ہے کہ جب اسکے بچے

بڑے ہو جائیں گے تو شاید اسے کچھ اچھے دن نصیب ہوں اس کے گھر میں خوشحالی آئے اور وہ بھی عام شہریوں کی طرح زندگی گزار سکے لیکن ہمارے ملک میں جہاں ملازمتیں محض خواب ہو کر رہ گئی ہیں جہاں ہر شخص ذریعہ معاش تلاش کرنے میں ہمہ وقت سرگرداں دکھائی دیتا ہے وہاں نابینا افراد کے بچے بھی اسی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں یاد رہے کہ ایسے نوجوانوں کی ملازمت اور ذریعہ معاش پر اس کے پورے گھر کا انحصار ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ جہاں نابینا افراد کے لئے ملازمتوں میں ایک فی صد کوٹہ مقرر کیا گیا ہے وہاں انکی اولاد کے سلسلے میں بھی کوئی اسی طرح کی صورت حال پیدا کی جائے۔ یہاں اس امر کی نشاندہی انتہائی اہم ہے کہ نابیناحضرات ایک فصید کوٹے سے بہت کم فائدہ اٹھا رہے ہیں اور چونکہ باقی معذورین بھی اسی ایک فصد کوٹے سے استفادہ کرتے ہیں اسی لئے نابیناافراد کے حصے میں جوکچھ آتا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے اور ایک فیصد کوٹے پر عمل درآمد ہماری اطلاع کے مطابق خال خال ہی ہوتا ہے بہر کیف نابینا افراد کو تو کسی نہ کسی بہانے سے اس کوٹے سے فیض یاب ہونے کا کم سے کم موقع ملتا ہے کم از کم انکی اولاد تو اس طرح کی سہولت سے بہرکیف فائدہ اٹھا سکتی ہے کیونکہ انہیں کوئی معذوری لاحق نہیں ہوتی کہ جس کے تصور ہی سے ہمارے معاشرتی ڈھانچے پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور تراحم کے چند لفظ ادا کرکے وہ اپنی سرخروئی کا سامان بہم کرلیتا ہے بہرحال ہمارے خیال میں یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسکی طرف نابینا افراد کی

تنظیموں کی توجہ بھی بہت کم ہوتی ہے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پہلو کو اجاگر کیا جائے تاکہ کسی طریقہ سے تو نابینا افراد کے مسائل کو کم کرنے کی کوئی سبیل نکل سکے۔

نابینا افراد اور اُن کا بچپن

ماہرین نفسیات اور عمرانیات اس امر پر متفق ہیں کہ زندگی کے اولین ایام کسی فرد کی شخصیت کی تعمیر میں اساسی اہمیت کے حامل ہیں وہ عوامل و عناصر جو شخصیت کی پرداخت کرتے ہیں یقیناً لائق اعتنا ہونے چاہئیں۔ معاشرہ لاکھ سہولیات فراہم کردے بچہ جوان ہو کر زندگی کی بے پناہ مسرتوں سے فیض یاب ہو جائے وہ اپنی قوت بازو سے اپنی جگہ بنا لے لیکن بچپن کے خواب' تمنائیں' امیدیں' خوشیاں' رنج' مایوسیاں اور نا امیدیاں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور چمکتی دمکتی' ہنستی کھیلتی شخصیت کے دل و دماغ میں جھانک کر دیکھئے تو بچپن کے سائے اپنی تاریکیاں پھیلاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اسی طرح بچپن کی خوشیاں زندگی کو اثر انداز کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ فرائڈ نے تحلیل نفسی کے حوالے سے بچپن کی اہمیت پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ اس لئے بچپن اور اس کے ماحول کا گہرا تعلق ہے بلکہ اس تعلق ہی سے زندگی نشوونما پاتی ہے اور شخصیت ارتقاء کی منازل طے کرتی ہے۔ گھر وہ اولین دبستان ہوتا ہے جو بچے کی شخصیت میں رنگ بھرتا

ہے' توانائیاں عطا کرتا ہے اور راہیں متعین کرتا ہے۔ اگر یہی بچپن حرماں نصیبی اور یاسیت کے حوالے ہو جائے تو تمام کوششیں اور کاوشیں بسا اوقات رائیگاں چلی جاتی ہیں۔

نابینا بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے ان کے بچپن کے حالات کا مطالعہ انتہائی دلچسپ ہوگا۔ ذرا غور فرمایئے۔ جب کسی گھر میں بچہ پیدا ہوتا ہے تو گویا خوشیوں کا سیلاب امڈ آتا ہے ہر طرف امیدوں اور آرزوؤں کی ریل پیل ہوتی ہے۔ والدین دل خوش کن منصوبے بناتے ہیں۔ اپنے لخت جگر' اپنے مستقبل' اپنے نور نظر کے لئے۔ لیکن اگر وہ بچہ بینائی سے محروم ہو تو ماں باپ کے پاؤں تلے کی زمین نکل جاتی ہے ان کی آرزوؤں اور امنگوں کا خون ہو جاتا ہے وہ اپنے بچے کا کسی سے ذکر تک بھی نہیں کرتے اور اعزہ و اقارب یہ اطلاع ملنے پر آہوں' بکاہوں' مایوسیوں اور حسرتوں کے تحفے لئے آن پہنچتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں اس طرح کا طرز عمل قابل فہم بھی ہے چونکہ نابیناؤں کی زندگی ایک انتہائی حوصلہ شکن تصویر پیش کرتی ہے۔ سڑکیں' گاڑیاں' بازار اس کے گواہ ہیں۔ پھر والدین اور اعزہ و اقارب کا مایوس ہونا کوئی غیر فطری امر بھی نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عہد جدید کی نعمتوں اور کامرانیوں سے جس طرح نابینا حضرات فائدہ اٹھا سکتے ہیں عوام الناس کو روشناس کرایا جائے کہ نابینائی اپنی جھولیوں میں مصائب تو لے کر

آتی ہے لیکن اگر جدید سہولیات سے کماحقہ' استفادہ کیا جائے تو نابینا حضرات ایک بھرپور اور توانا زندگی گزار سکتے ہیں بلکہ اپنے بہت سے بینا ساتھیوں کے مقابلے میں زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکل سکتے ہیں اگر عوام الناس کو اس حقیقت سے آشنائی ہو تو کسی نابینا بچے کی پیدائش پر صف ماتم بچھنے کی بجائے مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی تیاریوں کا سراغ ملے گا والدین مایوس ہونے کے بجائے اس حقیقت کو چیلنج کے طور پر قبول کریں گے۔

علاوہ ازیں اس امر کی ضرورت ہے کہ نابینا بچوں کے لئے والدین کو اس چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لئے تن تنہا نہ چھوڑا جائے اور حکومت نابینا بچوں کی کفالت کے لئے وظیفہ مقرر کرے تاکہ ایسے بچے کی پرداخت میں جو غیر معمولی اخراجات اٹھتے ہیں انھیں پورا کیا جاسکے جب والدین کو یہ معلوم ہوگا کہ ان کا بچہ دیگر بینا بچوں کی طرح زیور علم و ہنر سے آراستہ و پیراستہ ہو سکتا ہے اور ان کے لئے سہارا بھی بن سکتا ہے تو ان کی مایوسی از خود دم توڑ دے گی اور انہیں ایک طرح کی تسکین میسر ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ نابیناؤں کی تعلیم و تربیت اور بحالی کے لئے این جی اوز اور حکومتی ادارے اپنی بساط کے مطابق جتنی کوششیں چاہیں کرلیں جب تک وہ نابینا افراد کے والدین اور اعزہ و اقارب کو ساتھ لے کر نہیں چلیں گے ان کی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوسکتیں۔ ضرورت اس امر کی

ہے کہ نابیناؤں کے لئے تنظیمیں والدین کو اپنا رکن بنائیں اور انہیں ساتھ لے کر چلیں۔ یہ انتہائی ضروری ہے کہ پڑھے لکھے ماں باپ جدید خطوط پر اپنے بچوں کی تربیت کریں خود بریل سیکھ لیں تا کہ گھر میں اپنے بچوں کو بریل سکھا سکیں۔ ہمارے سامنے اکا دکا مثالیں موجود ہیں کہ والدین نے خود بریل سیکھی اور پھر اپنے بچوں کو سکھائی جیسا کہ قارئین کو معلوم ہو گا کہ بریل ایک ایسا انداز تحریر ہے جو ابھرے ہوئے لفظوں پر مشتمل ہوتا ہے جسے نابینا بچے چھو کر پڑھ لکھ سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ نابیناؤں کے والدین نابیناؤں کی نفسیات سے پوری طرح آگاہ ہوں اور ان کی تربیت سائنسی خطوط پر کریں عام مشاہدہ ہے کہ یا تو والدین نابینا بچوں کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس طرح وہ مایوسیوں کا شکار ہو جاتے ہیں یا پھر اتنی غیر ضروری توجہ دیتے ہیں' لاڈ پیار کرتے ہیں کہ وہ ابنارمل ہو کر رہ جاتے ہیں اور ان میں اعتماد اور حوصلہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ نابینا افراد کی تنظیموں کا فرض ہے کہ اس طرح کے سیمینار اور سمپوزیا منعقد کریں جس میں ایسے والدین مدعو ہوں یہ حقیقت ہے کہ نابینا بچے نابیناؤں کے لئے اداروں میں پڑھتے لکھتے ہیں اور اعتماد بھی حاصل کر لیتے ہیں لیکن ان کے گھر کا ماحول ان سے اعتماد چھین لیتا ہے ان کے ماں باپ یہ باور ہی نہیں کر پاتے کہ وہ کسی طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکتے ہیں اور جب والدین اور اعزہ و

اقارب کا یہ خیال ہوگا تو پھر معاشرے کے دیگر افراد سے کیا گلہ ہو سکتا ہے لیکن اس میں ایسے والدین مورد الزام نہیں ٹھہرائے جاسکتے بلکہ اس کے ذمہ دار وہ ادارے ہیں جو ایسے والدین کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہی نہیں کرتے ان سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے یہ سچ ہے کہ ایسے والدین اکثر ناخواندہ ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ والدین ہوتے ہیں اور انہیں حقائق سے روشناس کرا کے ان کا تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے اور ان کا تعاون نابینا بچوں کی تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے ایسے والدین کو خاص طور پر نابینا افراد کے مسائل سے آگاہ کیا جائے تاکہ وہ خود یہ کہہ اٹھیں کہ سچ ہے کہ ان کا نابینا بچہ بھی ایک دن اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے گا بلکہ ان کے بینا بچوں کی طرح ان کا سہارا بن سکے گا' قوم و ملک کے لئے اہم خدمات سرانجام دے سکے گا اور اگر صحیح حالات مہیا ہوں تو ہیلن کیلر اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین بن سکے گا۔



نابینائی اور تفریحی مشاغل

اس میں کلام نہیں کہ معروف آدمی کے پاس اشک ریزی کے لئے کوئی وقت نہیں ہوتا لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہمہ وقتی مصروفیت' دوڑ دھوپ' تگ و تاز جسے Mathew Arnold نے "Sick Horry" کہا ہے اور جسکے خلاف ورڈز ورتھ یوں نالہ کناں دکھائی دیتا ہے۔

"The world is too much with us' late and soon.
Getting and spending' we lay waste our powers:
Little we see in Nature that is ours:
We have given our hearts away' a sordid boon!

اور ایک اور شاعر William Devies یوں رقمطراز ہے۔

"What's this life if full of care
We have no time to stand and stare."

انسانی اعصاب کو مفلوج کرسکتی ہے اور اسکی تخلیقی صلاحیتیں ختم ہو کر رہ جاتی ہیں جہاں محنت عظمت کی ضامن ہے وہاں تفریح کے چند لمحات بھی صلاحیتوں اور قلب و ذہن کی قوتوں کو تر و تازہ رکھنے کے لئے از بس ضروری ہیں۔ مہذب اقوام محنت اور تفریح میں ربط باہمی قائم رکھتی ہیں اور توازن کو بگڑنے نہیں دیتیں۔

Benjamin Disraeli نے کہا تھا۔

"Increased means and increased leisure are
the too civilisers of man."

Russell نے کہا۔

"The thing I would wish to obtain from money
would be leisure with security."

اس سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ تفریح کار جہاں کو جاری و ساری رکھنے کے لئے کس قدر ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ Comte de Mirabeau کہتا ہے۔

"I will not exchange my leisure hours
for all the wealth in the world."

لیکن یہ تفریحی لمحے توازن سے بہرہ ور ہونے چاہئیں کیونکہ یہی بقائے حیات کے لئے ضروری ہے۔ Tynbee کہتا ہے۔

"To be able to fill leisure intelligently
is the last product of civilisation."

ان معروضات کے بعد ہمیں یہ کہنا ہے کہ اگر یہ مان لیا گیا ہے کہ بے بصر حضرات بھی گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسان ہیں تو ان کے لئے بھی تفریحی مشاغل از بس ضروری ہیں انہیں بھی کار جہاں ادا کرنے ہوتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں بھی الجھنیں، کشمکش اور تصادم ہوتے ہیں لیکن یہ دنیا بوجوہ آنکھ کی دنیا بن کر رہ گئی ہے اور باقی حسیات کے ساتھ زندگی نے روایتی سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا ہوا ہے ہر تفریح آنکھ کو خوش کرنے کے لئے وقف ہے بہر کیف نابینا حضرات کو بھی سکون و راحت کے چند لمحات درکار ہیں۔ لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ انکے تفریحی مشاغل کو اکثر طنز و تعریض کا نشانہ بنایا جاتا ہے یہاں تک کہ ان کے لبوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹیں بھی

تعجب کا باعث بنتی ہیں مجھے میرے ایک دوست نے بتایا کہ آج اس کے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا کوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔
"ویکھو حافظ وی ہندا اے" اسی طرح اگر کوئی نابینا موسیقی سے دل بہلانے لگے تو اس کے لئے بھی طرح طرح کے کلمات ادا کئے جاتے ہیں نابیناؤں کو تو گویا سادھو سمجھ لیا گیا ہے ان کی زندگی میں نہ کوئی مسکراہٹ ہے نہ کوئی قہقہہ۔ انہیں تو اللہ اللہ کرتے رہنا چاہئے۔ یہ سچ ہے کہ ذکر خدا اطمینان قلب کا ضامن ہے لیکن ثواب دارین حاصل کرنے کے لئے محض کسی بے بصر کی خدمات حاصل کرنا درست دکھائی نہیں دیتا اس کا بھی زندگی پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ کسی بینا فرد کا۔

Lewis mumford اس ضمن میں لکھتا ہے۔

"A society that gives to one class all the opportunities for leisure and to aother all the burdens of work' dooms both classes to spiritual sterility."

ان تمام معاشرتی رویوں کے باوجود نابینا حضرات کسی نہ کسی طریقے سے اپنے فارغ لمحات کو دلچسپ بنانے کی سعی ضرور کرتے ہیں ان کے پاس بہت سی ان ڈور گیمز بھی ہیں جن میں مصروف رہ کر وہ اپنے فرصت کے لمحوں کو دلچسپ بنا سکتے ہیں مگر یہ گیمز پاکستان میں مہیا نہیں ہیں کیونکہ انہیں خصوصی طور پر تیار کرنا پڑتا ہے نابینا حضرات اتھلیٹکس میں اپنے جوہر خوب دکھاتے ہیں ضروری ہے کہ اس ضمن میں رہنمائی فراہم کی جائے اور ان کھیلوں کو منظم کیا جائے۔ نابینا حضرات کو کرکٹ کھیلتے ہوئے تو بہت سے قارئین نے دیکھا ہوگا۔ یہ ایک ایسی گیند استعمال کرتے ہیں جس میں گھنگرو ڈال دیئے جاتے ہیں اور وکٹس کے پاس کسی ڈرم سے آواز پیدا کی جاتی ہے تاکہ نابینا کو سمت کا اندازہ ہو سکے۔ اس طرح کہ کرکٹ قومی

اور بین الاقوامی طور پر بھی کھیلی جاتی ہے اگر اس تمام طریقہ کار میں کوئی سقم دکھائی دے تو اسے نظرانداز کردیا جانا چاہئے میرے ایک نابینا استاد نے مجھے ایک بار کہا۔ "نابیناؤں کو وہ کام نہیں کرنا چاہئے جس میں Perfaction نہ ہو اور وہ بات استہزا کا باعث بنے۔ مجھے استاد محترم کی رائے سے تب بھی اختلاف تھا اور اب بھی ہے دراصل دل کو خوش کرنے کے لئے جو کچھ بھی کیا جائے درست ہونا چاہئے بشرطیکہ وہ اخلاقی طور پر درست ہو۔ نابیناؤں کے لئے اداروں میں اکثر و بیشتر موسیقی سکھانے کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے تاکہ ان کی تفریح کا کوئی سامان پیدا ہوسکے لیکن ایسے ادارے جو پبلک کے عطیات سے چلتے ہیں ان میں ایسا کرنا بھی مشکلات کا باعث ہوتا ہے کیونکہ موسیقی کو جائز تصور نہیں کیا جاتا اور اس میں شک بھی نہیں کہ موسیقی ہماری اسلامی ثقافت کی ترجمان نہیں لیکن صورت حال کا جائزہ وسیع تر تناظر میں لیا جانا چاہئے اور اصولوں کے نفاذ میں تخصیص سے کام نہیں لیا جانا چاہئے۔ صرف اسی طرح ہم ایک بھرپور معاشرتی اکائی کے طور پر زندہ رہ سکتے ہیں۔

نابینائی
ملٹن اور شیکسپیئر کی نظر میں

میرے ایک دوست نے مجھے ایک بار کہا کہ نابیناؤں کے خلاف تعصبات پھیلانے میں ادباء اور شعراء کا بھی ہاتھ ہے وہ نابینائی کو کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ بے چارگی کی تصویر بن کر رہ جاتی ہے اس میں تو کلام نہیں کہ نابینائی ایک بہت بڑا چیلنج ہے اور اس کے اپنے عذاب ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہمت کے کوہ گراں کے سامنے ان عذابوں کا تیشہ نہیں چلتا بہر کیف میں نے اپنے فاضل دوست کی خدمت میں عرض کی کہ اس طرح کے تعصبات پھیلانے میں ادباء اور شعراء کا زیادہ قصور نہیں کیونکہ ان کے رویئے بڑی حد تک معاشرتی رویوں ہی سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہی بات سڈنی (Sidney) نے کہی تھی کہ شاعر کچھ وثوق سے نہیں کہتا اس لئے اسے دروغ گو نہیں کہا جاسکتا اور غالباً" وہ افلاطون (Plato) کے اس اعتراض کا جواب دے رہا تھا کہ شاعر دروغ گو ہوتے ہیں اس لئے انہیں "مثالی جمہوریہ" سے باہر نکال پھینکنا چاہئے۔

جب میں اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ گو شاعر اور ادیب معاشرتی رویوں ہی سے اپنی تخلیقات کے لئے مواد اخذ کرتے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ادیب اور شاعر بے بنیاد رویوں کے خلاف علم بغاوت بھی بلند کر دیتے ہیں اگرچہ احتجاج فنکارانہ تقاضوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جہاں شاعر اپنے عہد

سے متاثر ہوتا ہے وہاں اسے متاثر بھی کرتا ہے۔

جہاں تک نابینائی کا سوال ہے بالعموم ماضی میں ہمارے شعراء اور ادباء کے سامنے اس کی یاس انگیز تصویر ہی آئی ہے۔ اس لئے ان کا فنکارانہ وجدان اسے اسی انداز سے پیش کرتا رہا ہے چنانچہ شیکسپئر جیسا عظیم المرتبت اور قد آور ڈرامہ نگار بھی نابینائی کے اسی پہلو کو پیش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ شیکسپئر ڈرامہ نگار تھا اس لئے اس کے کرداروں کے خیالات کو اس سے منسوب نہیں کیا جاسکتا یہ بات بڑی حد تک درست بھی ہے لیکن اگر کسی صورت حال کا ایک پہلو ہی ہمارے سامنے آئے تو ہمیں ڈرامہ نگار کی جانبداری کا احتمال ضرور گزرے گا۔ شیکسپئر کے معرکتہ الاراء ڈرامے King Lear کے ایک کردار Gloucester کی آنکھیں نکال دی جاتی ہیں اور وہ یاسیت کے عالم میں یوں گویا ہوتا ہے۔ "All dark and comfortless" اس کا بیٹا Edgar اسے دیکھ کر درد بھرے انداز میں پکار اٹھتا ہے۔

My father poorly led ! World' World' oh World!
But that thy strange mutations make us hate thee
Life would not yield to age.

گویا نابینائی موت سے بدتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ Gloucester مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق ہو جاتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے۔

I have no way' and therefore want no eyes.

لیکن یہ بلائے ناگہانی اس کی صلاحیتوں کو بیدار کردیتی ہے اور وہ کہنے لگتا ہے۔

"I stumbled when I saw: full oft 'tis seen
our means secure us and our mere defects
Prove our commodities.

خون کے آنسو روتا ہے لیکن Gloucester کا احساس بیدار ہو جاتا ہے اور وہ اپنے بیٹے Edgar جسے غلطی سے اس نے مجرم سمجھ لیا تھا اسے اب برہنہ گداگر کی شکل میں اپنے پاس محسوس کرکے پہچانتا تو نہیں لیکن اسے اسکی برہنگی پر ترس آجاتا ہے اور وہ اپنے ساتھی سے کہتا ہے کہ وہ اس کے لئے کوئی لباس لے آئے تو وہ اسکا بڑا ممنون ہوگا۔ Gloucester جب Lear سے ملتا ہے جو خود بھی اپنی بیٹیوں کی ظالمانہ ناسپاسی کے باعث اپنے حواس کھو بیٹھا ہے تو Lear اسے کچھ کچھ پہچاننے لگتا ہے اور اسے کہتا ہے پڑھو یہ ایک چیلنج ہے تو Gloucester زندگی کے بارے میں کچھ جانتا ہے تو وہ حیرت سے پوچھتا ہے۔

"What. art mad? A man may see how this
world goes with no eyes"

اگرچہ Gloucester کہہ چکا ہے کہ وہ محسوسات سے ادراک حیات کرتا ہے لیکن Lear کو یہ بات انتہائی تعجب خیز لگتی ہے یہ درست ہے کہ Lear نیم دیوانگی کی کیفیت میں ہے لیکن جہاں وہ زندگی کے سینکڑوں اسرار و رموز انتہائی سچائی سے بیان کر رہا ہوتا ہے اسے اس امر پر تعجب نہیں ہونا چاہئے تھا کہ ایک بے بصر زندگی کے بارے میں بے بہرہ ہوتا ہے لیکن اس سے زیادہ تعجب خیز بلکہ مضحکہ خیز صورت حال اس وقت سامنے آتی ہے جب 'Gloucester Edgar سے کہتا ہے کہ وہ اسے پہاڑی پر لے جائے تاکہ وہاں سے گر کر وہ خودکشی کر لے۔ Edgar اسے ہموار راستے پر لے جارہا ہوتا ہے اور اسے باور کراتا ہے کہ وہ پہاڑی پر چڑھ رہا ہے۔

Gloucester "You do climb up it' now look how we labour" کہتا ہے۔

Me thinks that the ground is even. لیکن پھر وہ یہ مان جاتا ہے کہ وہ پہاڑی کی انتہائی بلندی پر پہنچ گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک بے بصر انسان بلندی پر چڑھائی کا اندازہ نہیں لگا سکتا حالانکہ اس کا تعلق بینائی سے

نہیں بلکہ جسمانی محنت سے ہے لیکن شیکسپئر نے نابینائی کے مسئلے کو یہاں بے چارگی سے بلکہ بے حسی سے منسلک کردیا ہے جس کی توقع شیکسپئر جیسے اسقدر عظیم ڈرامہ نگار سے نہیں ہوسکتی تھی لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ شیکسپئر یہ سب کچھ سولھویں صدی میں لکھ رہا تھا جب نابینائی سچ مچ زندگی کی تنسیخ سے مماثل تھی لیکن بہ ایں ہمہ شیکسپئر جیسے نابغہ روزگار کو اس حقیقت کا بھی ادراک ہونا چاہئے تھا کہ نابینائی محض ایک جسمانی محرومی ہے۔ بہت سی دوسری صلاحیتوں کی تنسیخ نہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ Gloucester صرف نابینائی سے دو چار نہیں تھا بلکہ اس کے لئے زندگی ویسے بھی اندھیر ہوچکی تھی۔ تاہم نابینائی کی تصویر بیناؤں کے لئے کسی طرح تقویت کا باعث نہیں۔

اسی طرح ایک اور نابغہ روزگار جان ملٹن نابینائی کے بارے میں جس طرح اپنے تاثرات پیش کرتا ہے انہیں پڑھ کر نابینائی کے بارے میں یاسیت اور مایوسی کی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے ملٹن سترہویں صدی کا ایک معتبر نام ہے اسے انگریزی کا سب سے بڑا شاعر کہا جاسکتا ہے۔ Tennyson نے اسے یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

God gifted organ of the voice of England

کم و بیش اسکے بعد آنے والے ہر دور کا شاعر اس سے متاثر ہوا۔ ملٹن پینتالیس چھیالیس سال کا تھا کہ بینائی کھو بیٹھا اسکی آرزوئیں اور تمنائیں بے پناہ تھیں وہ شاعری کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دینا چاہتا تھا اور خدا کے پیغام کو عوام الناس تک پہنچانا چاہتا تھا' بینائی سے محروم ہونے کے بعد وہ مایوس ہوگیا اور اپنی نابینائی پر ایک نظم تحریر کی۔ اسے یہ بھری دنیا اندھیری نظر آنے لگی اور وہ محسوس کرنے لگا کہ اسکی سب صلاحیتیں مفقود ہوگئی ہیں اور یہ کہ جو صلاحیتیں موجود ہیں وہ نابینا ہوتے ہوئے ان سے استفادہ نہیں کرسکتا اور حکم الٰہی کی تعمیل نہیں کرسکتا اور پھر وہ یوں

سوال کرتا ہے۔

Doth God exact day-labour' light deny'd?

I fondly ask: but patience to prevent

That murmur' soon replies.

شاعر سوال کرتا ہے کہ کیا خدا روشنی کے کام روشنی کے بغیر بھی کروانا چاہے گا میں نے احمقانہ سوال کردیا اور فورا" جواب آیا وہ آگے لکھتا ہے کہ خدا کو انسان کے کام کی ضرورت نہیں وہ بہت عظیم ہے ہزاروں فرشتے اسکے حکم پر کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں اور وہ نظم کا اختتام یوں کرتا ہے۔

"They also serve who only stand and wait" یعنی وہ بھی اللہ کے خدمت گزار سمجھے جانے چاہیئں جو کھڑے رہتے ہیں اور انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ملٹن نے یہ فرض کرلیا کہ نابینائی تمام صلاحیتوں کی تنسیخ ہے اور یہ کہ نابینا سوائے انتظار کے اور کیا کرسکتے ہیں ان کے لئے کچھ کرنے کی آرزو ہی بہت ہے ملٹن کو شاید معلوم نہیں تھا کہ اس کی نابینائی اسکی صلاحیتوں کو جلا عطا کرے گی اور وہ Paradise Lost جیسی معرکتہ الاراء نظم لکھ پائے گا جو اسے ادبیات عالم میں بقائے دوام عطا کرے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں نابینائی کو ایک بہت بڑی آفت سماوی تصور کیا جاتا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ نابینائی انسان کی تمام صلاحیتیں چھین لیتی ہے ملٹن Paradise Lost کی تیسری کتاب کے آغاز میں روشنی کو خوش آمدید کہتا ہے اور اسے خدا کی طرح لافانی قرار دیتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ اگرچہ وہ اندھیروں میں گھر گیا ہے لیکن پھر بھی شاعری کی آسمانی دیوی نے اسے روشنی عطا کردی ہے اور وہ اشیاء کی حقیقت کو جاننے کے قابل ہوگیا ہے۔ عام زبان میں اسے بصیرت کہا جاتا ہے مگر ہمارے خیال میں یہ ان صلاحیتوں کے احیاء کا نام